ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

☆ دینی علوم کی تدریس اور ہندوستان کے مدارس کا نصاب
سید جلال الدین عمری

☆ ہندوستان میں اشاعت اسلام - اعتراضات کا جائزہ
ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

☆ انسانی حقوق اور فدائی حملے
ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

☆ 'فی ظلال القرآن' کی بعض تفسیری خصوصیات
جناب سید حامد عبدالرحمن الکاف

☆ علامہ خطابی کے علمی آثار
ڈاکٹر حاتم صالح الضامن

☆ تبصرے

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اکتوبر ——— دسمبر ۲۰۰۸ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

mrnadvi@yahoo.com

پان والی کوٹھی، دودھ پور، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ- ۲۰۲۰۰۱

Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com, tahqeeqateislami@gmail.com

Website: www.tahqeeqat-e-islami.co.in

سہ ماہی **تحقیقاتِ اسلامی** علی گڑھ

جلد: ۲۷ شمارہ:۴

شوال ——— ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ

اکتوبر ——— دسمبر ۲۰۰۸ء

آئندہ سے، پتا کی تبدیلی اور زرِ تعاون میں اضافہ سے متعلق اعلان صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ کریں

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۲۵ روپیے
سالانہ	۱۰۰ روپیے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۲۵ روپیے

بیرونِ ملک

سالانہ (انفرادی)	۴۰۰ روپیے
سالانہ (ادارے)	۶۰۰ روپیے

پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰۰ روپیے
سالانہ (ادارے)	۳۰۰ روپیے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپواکر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

دینی علوم کی تدریس، ہندوستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام- چند اعتراضات کا جائزہ — ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی — ۲۱

بحث ونظر

انسانی حقوق اور فدائی حملے — ڈاکٹر عبدالکریم عثمان — ۴۷

'فی ظلال القرآن' کی بعض تفسیری خصوصیات — جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف — ۷۵

سیر وسوانح

علامہ خطابیؒ کے علمی آثار — ڈاکٹر حاتم صالح الضامن — ۸۹

مترجم: مولانا سراج احمد برکت اللہ فلاحی

تعارف وتبصرہ

تعلیمات قرآن — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۴

قرآن کریم کی سائنسی تفسیر-ایک تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی — ۱۰۶

مولانا حمید الدین فراہیؒ-مفسّر ومحقق — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۰۹

تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ — مولانا سراج احمد برکت اللہ فلاحی — ۱۱۱

ابوالکلام آزاد (موضوعاتی ووضاحتی اشاریہ) — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۲

ماہ نامہ 'پیام' سری نگر (سماجی برائیاں نمبر) — " " — ۱۱۴

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۲۹) — ادارہ — ۱۱۵

فہرست مضامین ومضمون نگاران تحقیقاتِ اسلامی، جلد ۲۷، ۲۰۰۸ء — ۱۱۷

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر عبدالکریم عثمان
ریسرچ انوسٹیگیٹر، ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

۳۔ جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف
پوسٹ بکس نمبر: ۱۶۱۰۰، صنعاء، یمن

۴۔ جناب حاتم صالح الضامن
عراق

۵۔ مولانا سراج احمد برکت اللہ فلاحی
اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۶۔ ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی
سینیر سائنٹسٹ مسلم ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس
دارالفکر، اقرا کالونی، علی گڑھ

۷۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۸۔ محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۹۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

دینی علوم کی تدریس، ہندوستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات

سید جلال الدین عمری

۲۵/۲۶/۲۷/دسمبر ۲۰۰۳ء کو حیدرآباد میں جماعت اسلامی ہند کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے اسکول کی سطح کے ماہرینِ تعلیم و تدریس ۔ (Resource persons) کا ایک کیمپ لگا تھا۔ اس میں عاجز نے ذیل کا مقالہ پیش کیا تھا۔ اب نظرثانی کے بعد اس کی اشاعت کی نوبت آرہی ہے۔ یہ درس و تدریس کی دنیا سے عملاً غیر متعلق آدمی کا عمومی اظہار خیال ہے۔ اس میں بہت زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔ آج کل مدارس کے نصاب کا مسئلہ بار بار چھڑتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت واضح ہے۔ جو حضرات درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور اپنے تجربات رکھتے ہیں وہ اس پر بہتر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ تحقیقات اسلامی اسے خوش آمدید کہے گا۔ (جلال الدین)

برادرانِ محترم! اس وقت کی گفتگو کا موضوع ہے: 'دینی علوم کی تدریس، ہندوستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات'۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مدارسِ دینیہ، دینی علوم کے مراکز ہیں۔ یہیں سے صحیح معنوں میں دینی علوم کی تکمیل ہوتی ہے اور دینی علوم کے مختلف شعبوں کی درس و تدریس کا ان مدارس میں طویل عرصے سے ایک نظام قائم ہے۔ دین کی تعلیم کا دور اول سے ایک سلسلہ رہا ہے۔ اگر آپ دیکھیں تو صحابہ کرامؓ کے دور تک اس کا تسلسل ملے گا۔

صحابہ کرامؓ میں سے بعض حضرات مخصوص علوم کے ماہر ہوتے تھے اور نبی ﷺ نے خود توجہ دلائی کہ اگر کسی کو فلاں علم حاصل کرنا ہو تو فلاں صحابی سے حاصل کرے۔ پھر بعد میں ان کی یہ حیثیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی۔ روایتِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اسی طرح فقہی بصیرت کے لحاظ سے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نمایاں رہے۔ علم فرائض یا احکام و راثت میں حضرت زید بن ثابتؓ کو امتیاز حاصل تھا۔ حلال وحرام کے احکام سے حضرت معاذ بن جبلؓ کی واقفیت زیادہ تھی۔ یہ حضرات ان مختلف میدانوں میں لوگوں کا مرجع بنتے چلے گئے۔ صحابۂ کرام کے بعد تابعین کے دور میں بھی دینی علوم کا چرچا رہا اور اس کی جو شکل عہد رسالت اور عہد صحابہ میں تھی وہ کچھ زیادہ منظّم اور مربوط ہونے لگی۔ مساجد میں خاص طور پر اور کبھی کبھی گھروں پر بھی اصحابِ علم کے حلقے ہوتے تھے اور ان سے لوگ علم حاصل کرتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت سعید بن مسیّبؒ، جنھیں سید التابعین کہا جاتا ہے، مسجد نبوی میں ان کا حلقۂ درس قائم تھا۔ جس میں وہ احادیث رسولؐ پیش فرمایا کرتے تھے اور طلبہ انھیں سنتے بھی تھے اور نوٹ بھی کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت علقمہ ابن قیسؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ کے کوفے میں حلقے تھے۔ مکہ مکرمہ میں عکرمہؒ، عطاء بن ابی رباحؒ اور طاؤس بن کیسانؒ جیسے اہل علم وفضل تھے۔ مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافعؒ اور سالم بن عبداللہ بن عمرؒ مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگ ان سے مسلسل استفادہ کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کس مسئلہ میں کس سے رجوع کیا جانا چاہیے؟۔

صحابۂ کرام، تابعین اور پھر تبع تابعین کے دور میں کتاب وسنت کی تدریس اور اشاعت کا اسی طرح تسلسل رہا۔ بعد میں آہستہ آہستہ خالص قرآن وحدیث کے علوم کے ساتھ یونانی فلسفہ اور دیگر علوم بھی شامل ہوگئے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد ہی سے اس کا آغاز ہوگیا۔ بعض یونانی کتابوں کے عربی میں تراجم ہوئے، لیکن بنوعباس کے

دور میں اس کی طرف زیادہ توجہ ہوئی اور بڑی تیزی سے یونانی علوم منتقل ہوئے۔ ان میں فلسفہ، منطق اور علم کلام جیسے عقلی علوم بھی تھے اور طب، ہیئت اور ریاضی جیسے طبیعی علوم بھی۔ خاص بات یہ ہے کہ ہمارے علما نے بڑی دیانت کے ساتھ ان علوم کو منتقل کیا۔ اس وجہ سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ علوم صحیح طریقے سے منتقل نہیں ہوئے، یا ان کی صحیح ترجمانی نہیں ہوئی۔ دنیا تسلیم کرتی ہے کہ مسلمانوں کی وجہ سے یہ علوم محفوظ ہوگئے۔ مامون کے زمانہ میں ترجمہ کے اس کام میں بعض غیر مسلم بھی شریک رہے۔ ان علوم کے عام ہونے سے دینی نقطۂ نظر سے بعض نئے سوالات ابھرنے لگے اور ان پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ان علوم نے جو سوالات پیدا کیے وہ خالص دینی علوم سے متعلق سوالات سے بڑی حد تک مختلف تھے۔ دینی علوم کے سلسلے میں عام طور سے جو سوالات پیدا ہوتے تھے وہ اس طرح کے تھے کہ فلاں آیت کی شان نزول کیا ہے؟ اس کا تعلق کس واقعہ سے ہے؟ یہ عام ہے یا خاص؟ فلاں حدیث کسی آیت سے متصادم تو نہیں ہے؟ فلاں روایت کی سند کیسی ہے؟ اس کا کیا مفہوم ہے؟ اور وہ دوسری روایات سے متعارض تو نہیں ہے؟ صحابۂ کرام نے اس کا کیا مفہوم سمجھا؟ تابعین اور فلاں حلقے کے بزرگوں نے کیا معنی مراد لیے؟ اس سے کیا فقہی اور قانونی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے؟ اس پر عمل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

یونانی علوم کے متعارف ہونے کے بعد خدا کے وجود، آخرت، رسالت، ملائکہ جیسے بنیادی عقائد زیر بحث آگئے۔ کیا اللہ تعالیٰ موجود ہے؟ موجود ہے تو اس کے وجود کے کیا معنی ہیں؟ اس کی کیا صفات ہیں؟ ان صفات کا اس کی ذات سے کیا تعلق ہے؟ رسالت پر ایمان کیوں ضروری ہے؟ کسی معاملہ کے حسن و قبح کا فیصلہ عقل کرتی ہے یا اس کے لیے رسول کی راہ نمائی ضروری ہے؟ آخرت کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟ ملائکہ کا کیا تصور ہے؟

جو یونانی علوم منتقل ہوئے ان میں منطق بھی تھی۔ منطق اپنی بات کو مربوط اور مدلّل طریقے سے پیش کرنے کا فن ہے۔ اس سے یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ آدمی

اپنے دعوی کو ایک ترتیب سے اس طرح ثابت کر سکے کہ مخالف اس سے انکار نہ کر سکے۔ اس طرح ایک نیا علم کلام وجود میں آیا، جس میں الٰہیات یا مابعد الطبیعیات کے مسائل زیر بحث آئے۔ الٰہیات کے علاوہ طبیعی علوم کی طرف بھی مسلمانوں کی توجہ رہی۔ طب، ہیئت، کیمیا، جغرافیہ، ریاضی اور حیاتیات جیسے میدانوں میں انھوں نے یونان، ہندوستان اور دیگر ممالک کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور انھیں غیر معمولی ترقی عطا کی اور وہ خاص مسلمانوں کے علوم قرار پائے۔ اسے انھوں نے عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور اسلام کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔

مثال کے طور پر مسلمانوں کے حدودِ مملکت جب وسیع ہوئے اور نئے ممالک پر ان کی حکومت قائم ہوئی تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ ان ممالک میں نمازوں کے اوقات کیا ہوں گے؟ طلوع و غروب اور زوال کا ٹھیک تعیّن کیسے ہوگا؟ ایک مِثل اور دو مثل کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ سمتِ قبلہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کیسے ہوگا؟ اس پر مسلمان ہیئت دانوں نے جو تحقیق کی، صدیاں گزر گئیں ان کی تردید نہ ہوسکی۔ سمتِ قبلہ میں کہیں غلطی نہ ہوئی اور اوقاتِ نماز میں ایک منٹ کا فرق نہیں آیا۔

انسان کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اسے علاج کی سہولت حاصل ہو۔ اس مقصد سے مسلمانوں نے طب کی طرف توجہ کی۔ طب یونانی کو انھوں نے اس قدر ترقی دی کہ اسے خاص مسلمانوں کی طب کہا جاسکتا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے جو نئے نئے تجربات کیے موجودہ تحقیقات ان کی تائید کرتی ہیں۔

اس طرح اب قرآن، حدیث اور فقہ جیسے خالص اسلامی علوم، جنھیں علوم نقلیہ بھی کہا جاتا ہے، کی تعلیم کے ساتھ علوم عقلیہ (علمِ کلام اور علوم طبیعی) بھی تعلیم کا حصہ بن گیے اور مدارس میں ان کی تعلیم ہونے لگی۔ عربی مدارس کا باقاعدہ قیام چوتھی صدی ہجری سے شروع ہوگیا۔ مصر کا جامعہ ازہر فاطمیوں کے عہد سلطنت میں قائم ہوا۔ یہ المعزلدین اللہ کا دور (۳۵۸ھ تا ۳۶۵ھ) تھا۔ وہ اپنا ہزار سالہ جشن منا چکا ہے۔ بغداد کے نظامیہ نے، جسے جدید اصطلاح میں یونیورسٹی کہا جائے گا، بڑی شہرت حاصل کی۔ سلجوقیوں کے

دور میں ۴۵۸ھ میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ برصغیر میں بھی عربی مدارس کا سلسلہ صدہا سال سے قائم ہے۔ یہ مدارس آزاد بھی رہے ہیں اور بسا اوقات ان کو حکومت کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ ان کی پوری ایک تاریخ ہے۔ برصغیر کے عربی مدارس میں تقریباً ڈھائی سو برس سے عام طور پر درس نظامی رائج ہے۔ یہاں اسی سے متعلق بعض باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

درس نظامی ملاّ نظام الدین فرنگی محلی کا مرتب کردہ ہے۔ ملاّ نظام الدین کی پیدائش ۱۶۷۷ء کی ہے۔ ان کی وفات ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ اس طرح ۷۵/سال انھوں نے عمر پائی۔ ان کے آباء واجداد افغانستان کے علاقے ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ لکھنؤ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک مقام سہالی ہے، وہاں آباد ہوگئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ جب اکبر کو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ ہرات سے آئے ہیں اور ان کے خاندان میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہے تو سہالی میں اس نے ایک بڑی جائداد ان کے نام وقف کردی۔ اتنی بڑی جائداد کہ اس سے ان کے خاندان کی کفالت ہو اور وہ خود بھی اطمینان سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکیں اور جو طلبہ حصول علم کے لیے ان کے یہاں آئیں ان کے قیام وطعام کا بھی انتظام ہوسکے۔ لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ان کی عزت وسربلندی دیکھ کر سہالی کے عثمانیوں نے ان کو پریشان کرنا شروع کردیا۔ بالآخر ملاّ نظام الدین کے والد ملاّ قطب الدین لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کو معلوم ہوا تو اس نے اس خاندان کی خدمات کے پیشِ نظر ان کو لکھنؤ میں جگہ دی اور ایک بڑی کوٹھی ان کے نام وقف کردی، جو فرنگی محل کے نام سے معروف ہے۔ اسے فرنگی محل اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں فرنگی تاجروں کا عرصہ تک قیام رہا۔ جنگِ آزادی میں خاندانِ فرنگی محل کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس خاندان میں تصوف اور بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، جن کا جنگ آزادی میں نمایاں رول رہا ہے اور ملک کے سیاسی لیڈروں سے بھی جن کے قریبی روابط تھے، اسی خاندان کے فرد تھے۔ یہ خاندان جب فرنگی محل منتقل ہوا تو اُس

وقت ملاّ نظام الدین کی عمر ۱۱-۱۲ سال کی تھی۔ لکھنؤ پہونچنے کے بعد اس خاندان نے درس و تدریس کا قدیم سلسلہ شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اعتبار قائم ہوا، لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے اور مختلف مسائل میں فتوے بھی حاصل کرنے لگے۔ ملاّ نظام الدین نے ملک کے متعدد نام ور علما سے علم حاصل کیا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ تقویٰ و طہارت جیسے خاندانی اوصاف بھی ان میں پائے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگوں کا مرجع بن گئے۔ انھوں نے درس و تدریس کے کام کے ساتھ بعض کتابوں پر حاشیے بھی لکھے (حواشی دراصل کتابوں کی ایڈیٹنگ ہوتی تھی۔ یہ فن مغرب نے مسلمانوں سے سیکھا اور اسے ترقی دی)

ملاّ نظام الدین نے اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر مدارس کے لیے ایک نصاب (Course) تیار کیا، جسے ان کے نام کی مناسبت سے درسِ نظامی کہا جانے لگا۔ اس میں زیادہ تر زور اس بات پر رہا کہ عربی زبان سے اچھی واقفیت حاصل ہو۔ اس کے لیے انھوں نے صرف ونحو اور ادب کی بعض کتابیں تجویز کیں۔ بلاغت و معانی کی بھی دو ایک کتابیں رکھیں۔ اس کے ساتھ منطق، فلسفہ اور علم کلام اور تفسیر و حدیث وغیرہ کی کتب بھی درس میں شامل تھیں۔ یہ نصاب گیارہ علوم پر مشتمل تھا، کہ ایک عالمِ دین کو اِن گیارہ علوم سے واقفیت ہونی چاہیے۔ اسی طرح ان کا زور اس بات پر تھا کہ بچوں کو مختصر کتابیں پڑھائی جائیں، زیادہ لمبی چوڑی کتابیں نہ ہوں اور اگر ضخیم کتابیں پڑھائی جائیں تو ان کے کون سے ابواب یا مباحث پڑھائے جائیں اس کا بھی نصاب مقرر کیا۔

ملاّ نظام الدین کے تجویز کردہ نصاب میں بعض چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ عربی صرف ونحو کی تعلیم و تدریس کے لیے فارسی کتابیں تجویز کی گئیں۔ جیسے میزان منشعب، نحو میر، صرف میر، فصول اکبری۔ یہ ساری کتابیں فارسی میں ہیں۔ اس کے لیے طالب علم کو پہلے فارسی پڑھنی پڑتی تھی، پھر فارسی کے ذریعہ وہ عربی گرامر سیکھتا تھا۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ اس میں کافی وقت ضائع ہوتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اس نصاب کے ذریعہ

کوشش یہ ہوتی تھی کہ بعض مختصر کتابیں لڑکے حفظ کرلیں۔ مأۃ عامل، نحو کی ایک بہت مختصر کتاب ہے۔اس میں نحو کے مسائل اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔طلبہ انھیں سوچے سمجھے یا بے سوچے سمجھے حفظ کرلیا کرتے تھے۔ اس نصاب کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں معقولات پر زیادہ زور تھا۔ اس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، علم کلام اور عقائد پر جتنی توجہ دی گئی تھی، قرآن وحدیث پر بظاہر اتنی توجہ نظر نہیں آتی۔ حدیث میں مشکوٰۃ، جو کہ آٹھویں صدی میں خطیب تبریزی کا مرتب کردہ ایک مجموعۂ احادیث ہے، اس پر حدیث کی تعلیم ختم ہوجاتی تھی اور تفسیر میں جلالین پڑھائی جاتی تھی جو تفسیروں میں مختصر ترین تفسیر ہے۔ اس کے ذریعہ طالب علم کو کسی بھی مسئلہ میں اطمینان نہیں ہوسکتا۔ غالباً پیشِ نظر یہ تھا کہ طالب علم یونانی افکار سے اچھی طرح واقف ہوجائے، تاکہ وہ مخالفین کا جواب دے سکے۔ اس کے ساتھ اسلام کی تعلیم بھی ضروری حد تک ہوجائے۔

ملاً نظام الدین کے مرتب کردہ نصاب کے ساتھ ایک اور نصاب بھی ہندوستان میں جاری تھا۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء) کا مرتب کردہ تھا۔ حضرت شاہ صاحب ہندوستان میں جاری نصاب سے واقف تھے۔ اسی کے مطابق انھوں نے تعلیم پائی تھی اور اسی کی تدریس میں انھوں نے وقت بھی گزارا تھا۔ بعد میں انھوں نے دیارِ عرب کا سفر کیا۔ وہاں کے علما سے استفادہ کیا اور شیخ ابو طاہر الکردی المدنی سے حدیث میں سند حاصل کی۔ اس کا اثر ان کے مرتب کردہ نصاب میں نظر آتا ہے۔ اس میں یونانی علوم یعنی معقولات کا حصہ کم کیا گیا اور قرآن وحدیث کا حصہ زیادہ رکھا گیا۔ قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر، حدیث میں مشکوٰۃ کے علاوہ مؤطا اور صحاح ستہ جو حدیث کی مشہور کتابیں ہیں اس میں شامل تھیں۔ درس نظامی میں فقہ حنفی کا غلبہ رہا ہے۔ شاہ صاحب نے کوشش کی کہ چاروں فقہ سے طالب علم کی واقفیت ہو اور ان میں تطبیق کا ذہن فروغ پائے۔ اس پہلو سے شاہ صاحب کے یہاں دوسرے علوم کے مقابلہ میں حدیث پر زیادہ زور تھا۔ اگرچہ درس نظامی کی طرح شاہ صاحب کے نصاب کو قبولیت تو حاصل نہیں ہوئی، لیکن اس کا ایک حصہ درس نظامی میں شامل ہوگیا۔

اب جو درس نظامی ہے وہ صرف ملاّ نظام الدین ہی کا نہیں ہے، بلکہ اس میں شاہ ولی اللہ کی ترمیمات بھی شامل ہیں۔

برصغیر میں احناف کی اکثریت ہے۔ اس کے ساتھ مسلک اہل حدیث کے حامل بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ دونوں ہی حلقے حدیث میں حضرت شاہ صاحب سے نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم کے وارث آپ کے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء) ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق بھی ہیں۔ ان سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کو شرف تلمذ حاصل ہے، جن کا شمار بانیانِ دارالعلوم دیوبند میں ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند، جیسا کہ سب جانتے ہیں، فقہ حنفی کی تعلیم وتدریس کا ایک اہم مرکز ہے۔

دوسری طرف شاہ محمد اسحاقؒ کے ایک شاگرد شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ ہیں۔ اکثر علماء اہل حدیث کا سلسلۂ روایتِ حدیث ان تک پہنچتا ہے او رحدیث کی نشر واشاعت میں ان کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

ضمناً ایک قابل ذکر ایک بات یہ بھی ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سرسید احمد خاںؒ (م ۱۸۹۸ء) ہم کلاس اور شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے۔ سرسید کے اندر تقلید سے دوری اور براہ راست حدیث سے استفادہ کا جو رجحان رہا ہے، وہ بظاہر شاہ محمد اسحاق سے نسبت اور حدیث میں استفادے کا نتیجہ ہے۔

مدارس کے نصاب میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ جامعۂ ازہر کے نصاب میں شیخ محمد عبدہٗ نے بعض تبدیلیاں تجویز کی تھیں۔ ہندوستان کے مدارس کا نصاب بھی بے لچک نہیں رہا۔ اس میں بتدریج جو تبدیلی آتی رہی ہے، اس کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ یہاں کے نصاب میں تبدیلی کی زور دار آواز غالباً مولانا شبلیؒ (م ۱۹۱۴ء) نے سب سے پہلے اٹھائی۔ دیگر اصحاب علم نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی۔ گوکہ اب بھی بعض مدارس کا قدیم نصاب کم ہی تبدیل ہوا ہے، لیکن بعض مدارس کے نصاب میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

۱-کسی اجنبی زبان کی تعلیم کے لیے موجودہ دور میں نئے تجربات کیے گئے ہیں۔ اسے آسان سے آسان بنانے کی کوشش ہوئی ہے، تاکہ کم وقت میں وہ زبان سیکھی جاسکے۔عربی زبان کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی اس طرح کے تجربات ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں،بعض عربی مدارس ان سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔ان مدارس نے اپنے طور پر بھی ابتدائی درجات کے لیے اپنا نصاب تیار کیا ہے اور قدیم کتابوں کی جگہ نئی کتابیں ان کے ہاں شاملِ نصاب ہیں۔

۲-قدیم نصاب میں عربی ادب کی نثر ونظم کی اعلیٰ کتابیں کم تھیں۔لیکن اب بعض مدارس میں قدیم شعرائے جاہلیت کے کلام میں 'سبع معلقات' کے علاوہ بعض دوسرے شعراء کے دواوین بھی شامل ہیں۔نثر میں 'مقامات حریری' جیسی مغلق اور پرتصنّع کتابوں کی جگہ سبک اور رواں تحریریں پڑھائی جانے لگی ہیں۔بعض مجموعے بھی اس مقصد سے تیار کیے گئے ہیں۔

۳-قدیم نصاب جس مقصد سے مرتب کیا گیا تھا اس میں شاید تاریخ اور سیرت کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی۔ حالاں کہ کسی بھی امت کے لیے اپنے ماضی سے واقفیت بہت ضروری ہے۔اس سے اسے حوصلہ بھی ملتا ہےاورکم زوریوں کی اصلاح کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔عربی مدارس میں سے چند ایک نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ان مدارس میں رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی سیرت کے ساتھ بنوامیہ اور بنوعباس کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے۔اس کے ساتھ مقدمہ ابن خلدون، جوفلسفۂ تاریخ کی اہم کتاب ہے،کہیں کہیں داخلِ نصاب ہے۔

۴-قدیم نصاب میں منطق،فلسفہ اور ہیئت وغیرہ معقولات پر خاصا زور تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں کمی آتی چلی گئی۔اب بعض مدارس میں معقولات صرف اس حد تک رہ گئی ہیں کہ طالب علم ان کی مبادیات سے واقف ہوجائے، تاکہ قدماء کی کتابوں سے استفادہ میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

۵-دینی مدارس میں کہیں کہیں انگریزی کی تعلیم کا بھی نظم ہے۔اس لیے کہ یہ

ایک بین الاقوامی زبان ہے۔آج کے دور میں اس سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ملکی سطح پر ہندی کی خاص اہمیت ہے۔ان مدارس میں وہ بھی شاملِ نصاب ہے۔اسی طرح چند ایک مدارس میں سماجی علوم، خاص طور پر معاشیات اور سیاسیات سے ابتدائی واقفیت بہم پہونچائی جاتی ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بعض مدارس میں درسِ نظامی کسی قدر ترمیم کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور بعض مدارس میں وہ بالکل بدل گیا ہے اور نئے نصاب نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ یہاں کے طالب علم اس سے بھی بالعموم ناواقف ہیں کہ درس نظامی کیا ہے؟ اس کی تفصیلات کیا ہے؟ اور ان میں کیا ترمیم ہوتی رہی ہے؟۔

نصاب میں ان ترمیمات کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دینی مدارس کا مقصد بدل گیا ہے۔ان مدارس کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ طالب علم کو عربی زبان پر عبور ہو اور وہ قرآن وحدیث اور متعلقہ علوم سے براہ راست استفادہ کرنے لگے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ شریعت اسلامی کی صحیح ترجمانی کر سکے، آگے چل کر وہ اس قابل ہو کہ امت کی قیادت اور راہ نمائی کر سکے۔ اللہ کا دین تمام انسانوں کے لیے ہے۔اس لیے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کی دعوت وتبلیغ اور اس کی سربلندی کی بھی کوشش کرے گا۔

نصاب کی تبدیلی دراصل کتابوں کی تبدیلی ہے، مقصد کی تبدیلی نہیں ہے۔یہ مقصد سب ہی مدارس کے سامنے ہے، بلکہ یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ اب قرآن و حدیث کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم کی مختلف صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔کہیں براہ راست قرآن پڑھایا جاتا ہے، طالب علم کو مختلف تفاسیر کے مطالعہ کی ہدایت کی جاتی ہے۔اسی ذیل میں مفسرین کی رائیں زیر بحث آتی ہیں اور ان میں ترجیح کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہیں قرآن مجید کا ایک حصہ مختصر تشریح کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، جس میں صرف ونحو، لغت اور شان نزول سے واقفیت بہم پہونچائی جاتی ہے۔اور ایک حصہ کا درس تفاسیر کے

ذریعہ ہوتا ہے، تاکہ طالب علم ان کے طریقۂ تفسیر اور رجحانات وخصوصیات سے واقف ہوجائے اور دوسری تفسیروں کے مطالعہ کی اس میں صلاحیت پیدا ہوجائے۔

جہاں تک نصاب میں تفاسیر کا تعلق ہے، اس کا عام رواج ہے۔ عموماً جلالین پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بیضاوی کا ایک حصہ (سورۂ بقرہ) شاملِ نصاب ہے۔ کہیں بیضاوی کے اصل ماخذ زمخشری کو ترجیح دی گئی ہے۔ اب کہیں کہیں شوکانی کی 'فتح القدیر' کا ایک حصہ درس میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر تجربہ بظاہر کامیاب ہے اور اپنے مقصد کو پورا کر رہا ہے۔

قدیم نصاب میں حدیث کی کتاب 'مشکوٰۃ المصابیح' بہت تفصیل سے پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد بخاری، مسلم اور دیگر کتب صحاح کا دورہ ہوتا ہے، تاکہ طالب علم کی نگاہ سے یہ کتابیں گزر جائیں۔ کہیں کہیں اہم مباحث پر گفتگو بھی ہوتی ہے۔

اب رجحان یہ ہے کہ مشکوٰۃ کے بعد کتبِ صحاح کے دورہ کی جگہ ان کے ابواب کی تقسیم ہو۔ مثال کے طور پر کسی کتاب سے کتاب الایمان اور عبادات کا حصہ پڑھایا جائے، کسی سے نکاح، طلاق، خلع جیسے امورِ معاشرت کے ابواب رکھے جائیں، کسی سے بیوع اور حدود کے مباحث، کسی سے فضائل و آداب کے ابواب شاملِ نصاب ہوں۔ اس طرح ان میں سے کوئی کتاب مکمل تو نہ ہوگی، لیکن کتاب کا متعین حصہ تحقیق سے پڑھایا جاسکے گا اور اس سے کتاب کا انداز اور خصوصیات معلوم ہوجائیں گی۔ طالب علم چاہے تو بعد میں خود سے اس کا مطالعہ کر سکے گا۔

دنیائے علم بہت وسیع ہے۔ اب تو اس نے اور وسعت اختیار کر لی ہے۔ ہر موضوع شاخ در شاخ ہوتا چلا گیا ہے اور کسی ایک شعبہ میں بھی مہارت مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے تخصص (Specialization) کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسلامیات کے دائرہ میں بھی بہت سے علوم وفنون آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک فن میں تخصص کا رجحان ہمیشہ رہا ہے۔ اسی سے مفسر، محدث، فقیہ، مورخ، متکلم وغیرہ ہر فن کے ماہرین اور متخصصین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دور جدید میں مدارس عربیہ میں تخصص کو

باقاعدہ نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دین کی دعوت وتبلیغ بھی مدارس کے مقاصد میں شامل ہے۔ ادھر چند سال سے اس سلسلے میں بھی تخصص کا رجحان ابھرا ہے اور داعی اور مبلغ تیار کرنے کی کوشش ہورہی ہے جو اسلام کو سلیقہ اور حکمت کے ساتھ پیش کرسکیں۔ تخصص کی ان کوششوں کو بہت کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں کمیوں اور خامیوں کا احساس ہوسکتا ہے، لیکن اس کا رخ صحیح ہے۔ اس میں اصلاح کی گنجائش ہے جو بتدریج عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

مدارس عربیہ کے نصاب کو، جیسا کہ عرض کیا گیا، قطعی اور ناقابل ترمیم کبھی نہیں سمجھا گیا۔ اس میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ بعض لوگ اس میں سائنس اور جدید سماجی علوم بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ ہے، لیکن مدارس کے نصاب میں اس کی تھوڑی بہت گنجائش تو شاید نکالی جاسکتی ہے، لیکن بڑے پیمانہ پر جدید علوم کو اس میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کالج اور یونیورسٹی میں دینیات کے دو ایک گھنٹوں (Periods) کے لئے بمشکل گنجائش نکالی جاتی ہے یہی معاملہ عربی مدارس کا ہے۔ ان میں بھی جدید علوم کے لئے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ دونوں کے مختلف تقاضے ہیں۔ جدید علوم ہوں یا دینی علوم دونوں طالب علم کا پورا وقت چاہتے ہیں۔ اس کے بغیر اس میں مطلوبہ صلاحیت نہیں پیدا ہوسکتی۔

مدارس کی تعلیم یا اس کے نصاب کے ساتھ اس کے فارغین کی معیشت کا سوال بھی بار بار اٹھتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نصاب سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم کے سامنے معاش کے لئے بالعموم کسی مسجد میں امامت وخطابت اور چھوٹے چھوٹے مکاتب میں تدریس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ اس سے دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے اور محتاجی کی زندگی ان کی قسمت بن جاتی ہے۔

فارغین مدارس کی معیشت کا ذکر جس بھیانک طریقہ سے کیا جاتا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے۔ مسلمان یوں تو تعلیم کے میدان میں پیچھے ہیں، لیکن ان کے جو بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں ان کا مشکل سے دو تین فی صد مدارس کے فارغین کا ہوگا۔ باقی

ستانوے فیصد سے زیادہ طلبہ، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں اور وہیں کی سند رکھتے ہیں۔ ان میں جتنی بے روزگاری ہے اس تناسب سے مدارس کے فارغین میں نہیں ہے اور وہ ان کی طرح معاشی پریشانی میں بھی مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان کے سامنے معاشی ترقی کی بہت سی راہیں کھلی ہیں۔ اسے بہتر ملازمت مل سکتی ہے، وہ کسی اونچے منصب تک پہنچ سکتا ہے، کاروبار دنیا سے متعلق اسے بہتر معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

عربی مدارس کو ان باتوں کا احساس ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل تدابیر اختیار کی گئی ہیں:

بعض عربی مدارس کے نصاب میں انگریزی اور ہندی کسی حد تک شامل ہے۔ چند ایک سماجی علوم کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ اب تو کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جارہی ہے۔

ایک صورت یہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ مدارس سے فراغت کے بعد دو ایک سال جدید علوم کے لئے مخصوص کیے جائیں، تاکہ کسی ایک شعبہ میں طالب علم کے اندر بہتر صلاحیت پیدا ہوجائے اور حسب ضرورت وہ مقابلہ (Competition) میں بھی حصہ لے سکے۔ اس پر اہل مدارس کو غور کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی بعض یونیورسٹیاں عربی مدارس کے نصاب کو گریجویشن کے مساوی یا اس سے کم یا زیادہ تسلیم کرتی ہیں۔ جب سے عرب ممالک میں تیل کی دولت آئی ہے اور عربی زبان نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی ہے مزید یونیورسٹیاں مدارس کے نصاب کو تسلیم کرتی جارہی ہیں۔ خود مدارس کے طلبہ میں یہ رجحان ہے کہ فراغت کے بعد ان یونیورسٹیوں میں داخلہ لیں اور وہاں کی سند حاصل کریں۔ اس طرح کے طلبہ کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ اس سے معاشی میدان میں ان کے لئے مواقع بھی فراہم ہورہے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ دینی تعلیم کا اہتمام امت کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ہر بستی میں ایسے کسی فرد یا افراد کا ہونا از روئے شریعت

ضروری ہے جو بستی کے رہنے والوں کو دین کی تعلیم دے، انھیں احکام شریعت بتائے اور پیش آمدہ مسائل میں ان کو دینی راہنمائی فراہم کرسکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وحدیث پر اس کی براہ راست نظر ہو، وہ مختلف مسائل میں اصحاب علم کی رایوں سے واقف ہو اور ان کے سامنے صحیح نقطۂ نظر پیش کرسکے۔ اس طرح کے افراد مدارس ہی فراہم کرتے چلے آرہے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس کی کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔

جہاں تک ان کی معاش کا مسئلہ ہے ایک اسلامی ریاست کو اس طرح کے معلمین کی معاشی کفالت کرنی چاہئے اور ان کو اس کا موقع فراہم کرنا چاہئے کہ آزادی کے ساتھ دینی راہنمائی کا فرض انجام دے سکیں، لیکن اب جب کہ اسلامی ریاست نہیں ہے تو یہ امت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت اور بہتر معیشت کا نظم کرے۔ اسے مقامی آبادی پر نہ چھوڑا جائے، بلکہ اس سے وسیع دائرے میں اسے حل کرنے کی کوشش ہو۔ یہ کام صوبائی سطح پر بھی ہوسکتا ہے اور کوشش کی جائے تو ملکی سطح پر بھی اس کا کوئی نظم وجود میں آسکتا ہے۔ اوقاف سے بھی اس میں مدد لی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر کما حقہ غور نہیں کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر غور ہو اور کوئی بہتر اور باوقار صورت نکالی جائے۔

یہاں ہم ایک خاص مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے۔

آج کل مدارس کے متعلق یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ ان میں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کے ذریعے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ دین اور دین کی تعلیم و تدریس کے خلاف ایک عالمی سازش کا نتیجہ ہے۔ اگر چند باتیں سامنے رکھی جائیں تو اس کی نامعقولیت واضح ہوسکتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اس کے پورے نصاب (Curriculum) پر غور کرنا چاہیے کہ کیا یہ طالب علم کو کسی غلط راہ پر لے جاتا ہے؟ کیا اس سے اس کا ذہن تخریب کاری اور دہشت گردی کا بنتا ہے؟ اس نصاب کے تحت یہ شکایت عام ہے کہ اس سے طالب علم زمانے سے بے خبر اور جدید افکار و رجحانات سے ناآشنا رہتا ہے۔ پھر اس سے

کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ماحول کے خلاف بغاوت کے لیے کھڑا ہو جائے گا؟

بعض لوگ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث ہی میں اس کا مواد موجود ہے۔ یہ ایک اتہام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مواد کی نشان دہی کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اپنے مزعومہ خیالات کو قرآن وحدیث میں زبردستی ڈھونڈ نکالنے کی کوشش نہ کی جائے اور سیاق وسباق سے کاٹ کر ان کی تعلیمات کو نہ دیکھا جائے، اس طرح کا کوئی حوالہ نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ قرآن وحدیث کی تعلیم تو ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ صدیوں سے مدارس کا سلسلہ قائم ہے۔ اگر اس سے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں تو یہ نتیجہ ہر دور میں نکلنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کہ جو کارنامہ، صدیوں میں انجام نہیں پایا، اب ایک بڑی طاقت کے اشارے پر وہ مواد بھی نکل آیا اور دہشت گرد بھی پیدا ہونے لگے۔

۲۔ دینی مدارس پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کا ماحول کیا ہے؟ ان میں کیسی فضا پائی جاتی ہے؟ کن موضوعات پر بحث وتمحیص ہوتی ہے؟ اساتذہ اور طلبا کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں کیا ہیں؟ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان میں خدا پرستی، انسانوں کے ساتھ ہمدردی، اخلاق، شرافت، تہذیب، ادائے حقوق، ظلم سے اجتناب اور عدل وانصاف کی تعلیم ہوتی یا اس کے برخلاف کوئی دوسری راہ دکھائی جاتی ہے۔ مدارس کے ماحول میں بعض کم زوریوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں غیر قانونی اور تخریبی نوعیت کی سرگرمیاں جاری ہیں اور ان کی ہمت افزائی ہو رہی ہے۔

۳۔ اب تک جن افراد پر دہشت گردی کے الزام لگے ہیں، ان میں سے بیش تر الزامات اب تک محتاج ثبوت ہیں۔ جن افراد پر الزام ہے ان میں ڈاکٹرس، انجینیرس، انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلق اور جدید تعلیم سے آراستہ افراد، عربی مدارس کے فارغین کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہیں۔ کیا اس کی بنیاد پر یہ کہا جائے گا کہ کالجوں، یونیورسٹیوں اور جدید ٹیکنیکل اداروں میں دہشت گردی کی تعلیم ہوتی ہے اور وہاں سے تخریب کار پیدا ہوتے

ہیں؟ اس طرح کی لغو بات کوئی علم دشمن شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ کسی ہوش مند اور صاحب علم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۴۔ دہشت گردی اور تخریب کاری میں بعض غیر مسلم بھی ملوث پائے گئے ہیں۔ آخر ان کی تعلیم کن مدارس میں ہوئی ہے؟ کیا اسے بھی ان کے مذہب اور ان کے تعلیمی اداروں سے اسی طرح جوڑا جاتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کے اسباب کچھ اور ہی ہیں۔ جب تک ان اسباب کا ٹھیک سے جائزہ نہ لیا جائے اور انھیں دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے دہشت گردی پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ حکومتیں اور فرقہ پرست تنظیمیں نہ یہ اسباب جاننا چاہتی ہیں اور نہ ان کے ازالے کی انھیں فکر ہے۔ وہ ایک خاص طبقے کو نشانہ بنا کر ان اسباب سے توجہ ہٹانا چاہتی ہیں۔ یہ حکمت عملی کسی بھی طرح ملک وقوم کے لیے مفید نہیں کہی جاسکتی۔

مقالہ نگار حضرات سے گزارش

۱- تحقیقاتِ اسلامی میں صرف غیر مطبوعہ مقالات شائع کیے جاتے ہیں، اس لیے جو مقالہ اس میں اشاعت کے لیے بھیجیں اسے کسی دوسرے رسالے میں ہرگز نہ بھیجیں۔

۲- اگر تحقیقاتِ اسلامی میں کسی مقالہ کی کسی وجہ سے اشاعت ممکن نہ ہوگی تو اس کی اطلاع کردی جائے گی۔ سہ ماہی رسالہ ہونے کی وجہ سے عموماً مقالہ نگاروں کو زحمت انتظار برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔

۳- فوٹو اسٹیٹ کاپی میں بسا اوقات بعض الفاظ یا حروف مٹ جاتے ہیں۔ اس لیے براہ کرم مقالہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں اور اصل کاپی روانہ کریں۔

۴- مقالہ خوش خط، ورق کے ایک جانب، صفحہ کے دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھا جائے۔ بہتر ہے کہ اسے کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بھیجا جائے۔ کمپیوٹر کتابت کی صورت میں ای میل کے ذریعے بھی بھیجا جاسکتا ہے، مجلّہ کا ای میل ایڈریس یہ ہے:

tahqeeqateislami@gmail.com + tahqeeqat_islami@yahoo.com

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام
چند اعتراضات کا جائزہ

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ بالعموم وہی ہیں جو پوری دنیا میں اسلام کے پھیلنے کے سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ مسلمان فرماں رواؤں نے دنیا کے جن جن علاقوں میں حکم رانی کی ان میں بیش تر کے سلسلے میں یہی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان حکم رانوں نے تلوار کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا۔[۱] یہ اعتراضات ہندوستانی افق پر زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان اعتراضات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مسلمان حکم رانوں کی تلوار زنگ آلود ہو گئی تھی۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) اس پہلو پر بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خون خوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا، جب کہ پیروانِ اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتابِ عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی۔ اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب کہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی، مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی

کم زور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود دوسری قوموں پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، آخر انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فردِ جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا اس مورخانہ تحقیق و تفتیش اور عالمانہ بحث و اکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت و ناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود ان کی اپنی خوں ریزی کے خلاف امنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے۔''[۱] الف

ہندوستان میں اشاعت اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو دو گروہ اور دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروہ انگریزوں کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور ان کے زیر سایہ عیسائی مشنریوں نے تبلیغ عیسائیت کی منصوبہ بند کوششیں کیں۔ اسلام ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ انہوں نے اسلام پر عیسائیت کی بالاتری دکھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر جارحانہ حملے کیے اور اسلام کو ایک خوں آشام، غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کے زیر اثر بعض ہندوؤں نے بھی اسلام کے خلاف مناظرانہ محاذ آرائی کی۔ دوسرا گروہ اس ملک کے غیر مسلموں کا ہے۔ ان کے اعتراضات کا سلسلہ بالخصوص ہندوستان کی آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے اس میں اتنی شدت نہ تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں یا عہد حاضر میں پائی جاتی ہے۔ ایک خاص جماعت جو ہندوتو کی علم بردار ہے، اس میں پیش پیش ہے۔ کیوں کہ وہ ملک میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتی ہے۔ یہ لوگ باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے نہ تو مسلمانوں کو متاثر کر سکے ہیں اور نہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں برتر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لیے اب انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ اسلام میں زبردستی خامیاں نکالی جائیں اور پروپیگنڈے کے زور پر عوام کے

سامنے اسے بھیانک شکل میں پیش کیا جائے۔اس کے لیے اب انہوں نے ٹی وی چینلوں، ڈراموں، افسانوں،فلموں ،قصوں، کہانیوں اور جھوٹی تاریخ نویسی کا سہارالیا ہے اور وہ مختلف قسم کے بے بنیاد بلکہ خیالی مناظر کے ذریعہ پروپیگنڈہ کرکے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔

اعتراضات کے مصادر پر ایک نظر

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام سے متعلق بالعموم جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کا سرچشمہ وہ لٹریچر ہے جو انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تیار کیا، جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ یہاں کی دو بڑی قومیں ہندوؤں اور مسلمانوں (جو عرصہ دراز سے پرامن ماحول میں روادارانہ طریقے سے زندگی بسر کرتے آرہے ہیں) کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکا دی جائے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں اور انہیں اتنی فرصت نہ ملے کہ ہماری جابرانہ اور ظالمانہ روش کی طرف توجہ کرسکیں۔ چنانچہ جب اس جذبہ کے تحت ہندوستان کی تاریخ رقم کی گئی تو ایک طرف مسلمان بادشاہوں کو ظالم و جابر ٹھہرایا گیا کہ وہ ہندوؤں کے سخت دشمن تھے، اس کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر مظالم ڈھاتے اور ان کے مذہبی مقامات کو مسمار کرتے تھے، یہ شوشہ بھی چھوڑا گیا کہ شیواجی مسلمانوں کے حق میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے، کیوں وہ پکے اور سچے ہندو تھے۔اس قسم کے اعتراضات سب سے پہلے بمبئی کے گورنر الفسٹن کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئے جو بہت جلد ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیے گیے۔یہاں تک کہ اسے شامل نصاب کرکے بچوں کو بھی پڑھایا جانے لگا۔[۲]

ہسٹری آف انڈیا اور آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا تاریخی اعتبار سے بڑی اہم کتابیں سمجھی اور پڑھی جاتی ہیں۔یہ ڈاکٹر ونسنٹ اے اسمتھ کی سخت عرق ریزی کا نتیجہ تھیں اور بڑی لاگت سے زیورطبع سے آراستہ ہوئیں۔ان کی انفرادیت اور اہمیت اہل علم کے نزدیک مسلّم ہے، مگر اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں بہت سے اہم گوشے واضح ہوتے ہیں وہیں اس میں زہریلے بیانات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔اکثر معمولی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر مسلم حکم رانوں کی خوبیوں پر پردہ ڈالا گیا اور خامیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان

کیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان سلاطین متعصب اور تنگ نظر تھے، ان کا مقصد ہندوؤں کو تباہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں اکثر مسلمانوں کے آباء واجداد کا مذہب خوف یا لالچ سے تبدیل کروایا تھا۔ انگریزوں نے آکر ہندوؤں کو ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائی۔

الیٹ اور ڈاوسن کے ذریعے ہندوستان کی جو تاریخ لکھی گئی ہے اس میں بھی فرقہ وارانہ روش اختیار کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلّی نے یوں تبصرہ کیا ہے:

''خود ہندوستان میں برسوں پہلے سر ہنری الیٹ اپنی مشہور کتاب 'ہندوستان کی تاریخ خود اپنے مورخین کی زبانی' ترتیب دے چکے تھے اور ان کے انتقال کے بعد ڈاوسن کی کوششوں سے شائع بھی ہو چکی تھی۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ایک بے حد جابرانہ اور انتہائی ظالمانہ حکومت تھی، جس کا عدل و انصاف سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جس کے زیر سایہ بنیادی انسانی اقدار قطعی غیر محفوظ تھیں۔ سازش، شراب نوشی، عیاشی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ عیش وطرب کے لوازم مہیا کرنے کے لیے عوام کا بے دردانہ استحصال، جس کا نشانہ خصوصاً غیر مسلم عوام ہوتے تھے، اس حکومت کا نشان امتیاز تھا۔ معاشی استحصال، سماجی نابرابری اور مذہبی رواداری کا یکسر فقدان اس عہد کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ غرض اس کتاب کے صفحات سے مسلم دورِ حکومت کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو کسی بھی طرح قابلِ فخر نہیں کہی جاسکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی مہارت اور چابک دستی سے اقتباسات کو ایک خاص ترتیب سے اکٹھا کیا گیا ہے اور انہیں اپنے مخصوص سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اقتباسات کے انتخابات میں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھی گئی ہے کہ صرف ایسے حصوں کو منتخب کیا جائے جن سے مسلم حکمرانوں اور ان کے نظام حکومت کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی تصویر ابھر کر سامنے آئے۔''[۳]

اسی طرح ایم۔اے۔ ٹائیٹس نے مسلمان بادشاہوں کے متعلق جو زہریلا مواد

قارئین کی نذر کیا ہے وہ بھی بڑا دل خراش ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا، جس پر بعد تک عمل ہوتا رہا۔ اس میں اس نے بالخصوص محمد بن قاسم اور اورنگ زیب سے متعلق بہتان تراشی کرتے ہوے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ میں مندروں کے انہدام کا جو منصوبہ بند پروگرام شروع کیا تھا، وہ عہد عالم گیری تک جاری رہا۔[۴]

عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھنے کی طرف ہندوؤں نے توجہ نہ دی۔ سوائے کلہن کی 'راج ترنگی' کے کوئی اہم تاریخی کتاب ہندوؤں کے یہاں نہیں پائی جاتی اور وہ بھی کشمیر کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ تاریخ نویسی کا کام مسلمانوں نے ابتدا سے کیا ہے اور یہ فن ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں عروج پر پہنچا۔ کم وبیش اکثر فرماں رواؤں کے زمانہ کی تاریخ کسی نہ کسی حد تک رقم ہوئی، جس کی زبان فارسی، عربی اور ترکی تھی۔ انگریز شاہ جہاں کے زمانہ سے ہندوستانی افق پر ابھرے۔ اس وقت تک ان کی حیثیت اس ملک میں بس اتنی تھی کہ سلاطین اور امرا کو جب کبھی ان کی عیاری اور مکّاری کا علم ہوتا تو ان کی گوش مالی کر دیتے اور وہ ادھر سے ادھر منتشر ہو جاتے تھے۔ انھوں نے بتدریج ہندوستان میں قدم جمائے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس افراتفری کے زمانے میں انگریزوں نے کیوں کر اور کس طرح عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا کہ وہ اپنی تاریخی کتابوں میں مسلمانوں کی تاریخ اور دوسری کتابوں کا حوالہ بڑے کرّ وفر سے پیش کرتے ہیں اور پھر مسلمان مورخین نے اپنی تاریخی کتابوں میں اپنے بادشاہوں کے ناکردہ مظالم کا ذکر آخر کس مقصد سے کیا ہے، جن کا حوالہ انگریز مورخوں نے دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس عہد میں جو تاریخی کتابیں تھیں ان میں سے اکثر کتابیں آج بھی پائی جاتی ہیں، جن میں ان بادشاہوں کے مظالم کا ذکر نہیں ہے اور اگر کہیں کہیں اس طرح کی کچھ باتیں پڑھنے کو مل بھی جاتی ہیں تو ان کے سیاق وسباق سے واقعہ کو جوڑ کر نتیجہ نکالا جانا چاہیے۔

انگریز مورخوں کی دروغ بیانی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے

حوالوں میں مقامی روایت اور گزیٹیر کا حوالہ کثرت سے دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کب اتنا وقت میسر آ گیا کہ انہوں نے ہندوستان کے ہر علاقے کا سروے کر کے اس کا مکمل ریکارڈ جمع کر لیا۔ یہ بات درست ہے کہ اوپر جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے ان میں بیش تر کتابیں ۱۹ رویں صدی کے اختتام تک یا آزادی سے قبل زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ اس وضاحت سے راقم کا مدعا یہ ہے کہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں تاریخی استناد سے خالی ہیں اور مقامی روایات کی جو کثرت ہے وہ مشکوک ہے۔[۱۵] اس لیے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور مطالعہ کے وقت بالخصوص ان کے تاریخی استناد کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ انگریزوں کو اگر ان زبانوں پر عبور حاصل تھا تو پھر انہوں نے تصنیف و تالیف اور تراجم کے جو ادارے قائم کیے ان میں مسلمان عالموں کی مدد حاصل نہ کرتے۔ اگر ان کے معاش کی انہیں فکر تھی تو دوسرے اہم شعبوں میں مسلمانوں کی جو قلت ہو گئی تھی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ دراصل ہندوستان کی تاریخ اور تذکروں کے تراجم وغیرہ پر انہوں نے جو محنت کی اس سے اسلام کی محبت کے بجائے عناد کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے واقعات کو اس انداز میں توڑ مڑور کر پیش کیا ہے کہ اصل واقعہ کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور فرقہ واریت کی بو اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے عزائم کا پردہ فاش کرتے ہوئے نو مسلم مفکر علامہ اسد لکھتے ہیں:

''یورپین کا رویہ اسلام کے بارے میں اور صرف اسلام ہی کے بارے میں دوسرے غیر مذاہب اور تمدنوں سے بے تعلقی کی ناپسندیدگی ہی نہیں، بلکہ گہری اور تقریباً بالکل مجنونانہ نفرت ہے۔ یہ محض ذہنی نہیں ہے، بلکہ اس پر شدید جذباتی رنگ بھی ہے۔ یورپ بدھشٹ اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات کو قبول کر سکتا ہے اور ان مذہبوں کے متعلق ہمیشہ متوازن اور مفکرانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے، مگر جیسے ہی اسلام کے سامنے آتا ہے، اس کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے اور جذباتی تعصب آجاتا ہے۔ بڑے سے بڑے یورپین مستشرقین بھی اسلام کے متعلق لکھتے ہوئے غیر معقول جانب داری کے مرتکب ہو گئے ہیں .....

اس طریقۂ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین کے ادب میں ہمیں اسلام اور اسلامی معاملات کی بالکل مسخ شدہ تصویر ملتی ہے۔ یہ چیز کسی ایک خاص ملک میں محدود نہیں، بلکہ جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، غرض ہر جگہ جہاں یورپین مستشرقین نے اسلام سے بحث کی ہے، انہیں جہاں کہیں بھی کوئی واقعی یا محض خیالی ایسی بات نظر آتی ہے جس پر اعتراض کیا جاسکے، وہاں ان کے دل میں بدنیتی کی مسرت کی گدگدی ہونے لگتی ہے۔''[۶]

فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں بعض ہندوستانی مورخین نے بھی اپنا کردار انجام دیا ہے۔ مثلاً مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب کے نام سے ۵/جلدوں میں کتاب لکھی۔ اس میں اس نے جہاں ایک طرف اورنگ زیب کے حالات، افکار، ملکی نظم ونسق، علم اور علما پروری اور کارناموں کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے، وہیں بعض جگہوں پر اسلام، مسلمان اور اورنگ زیب کے عادات وخصائل پر جارحانہ حملے بھی کیے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کی جلد سوم کا ایک پورا باب ''اسلامک اسٹیٹ چرچ'' کو اس بحث کے لیے وقف کردیا ہے کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے، جو اپنے متبعین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوٹ مار اور خوں ریزی کو مذہبی فرض سمجھو، یہ دنیا کے امن کا دشمن ہے اور اس کی رو سے رواداری ناجائز ہے، حکومت مغلیہ مکمل قزاقی تھی، مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم ابھر نہیں سکتے تھے۔ اورنگ زیب کی عدم رواداری کا ذمہ دار اسلام تھا، کیوں کہ وہ شجر اسلام کا ایک پھل تھا، جب درخت ہی کڑوا ہے تو پھل لامحالہ کڑوا ہوگا۔[۷]

اس کتاب کی زہر افشانی کے متعلق ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''دوسری کتاب مشہور تاریخ داں جادو سرکار (سر جادو ناتھ سرکار) کی لکھی ہوئی ہندی اور انگریزی زبانوں میں موجود ہے، ویسے 'سر' کا خطاب انگریزوں نے زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو دیا، جنہوں نے انگریزوں کے خیالات و بہبودی کا خیر مقدم دل کھول کر کیا۔ جادو ناتھ سرکار کی کتاب پڑھنے پر ہمیں بڑی دل چسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ سرکار صاحب کوئی ایسا قدم اٹھانے سے باز نہیں آتے ہیں، محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اورنگ زیب مغلیہ عہد کا بدترین بادشاہ تھا، جب کہ ہمیں انہی کی کتاب میں

اورنگ زیب سے متعلق ایسی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن پر غور کرنے سے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ وہ اتنا کٹّر، ظالم اور متعصب نہیں تھا جتنا بتایا گیا ہے۔اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اگر ہم سرکار صاحب کی کتاب میں شائع اورنگ زیب کے فرمانوں' کا مطالعہ کریں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔''۸

بعض اور مورخین مثلاً ایشوری پرساد، سری رام شرما، آشروادی لال وغیرہ نے مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی اور میڈول انڈین کلچر کے نام سے عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کی تاریخ لکھی، ان میں بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ بیش تر حکم رانوں کی سیاسی و مذہبی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس کے ضمن میں پورے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان بادشاہوں کو اسلام پھیلانے کے لیے جبر وتشدد کی پالیسی اپنانے میں کوئی مضایقہ نہیں رہا۔۹

اس قسم کا زہریلا لٹریچر عوام کے سامنے آیا تو بلا تفریق مذہب وملت لوگ ان سلاطین کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔آج بھی تاریخ کے بعض طالب علموں کے ذہنوں سے یہ غلط تاثر زائل نہ ہوسکا ہے۔ان میں سے کچھ طالب علم تحقیق وتخریج کے میدان سے گزرتے ہیں تو انہیں اصل صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں بالخصوص الیٹ کی تاریخ نے عوام کے ذہن میں ایسا تاثر پیدا کیا ہے کہ آج بھی جب اس کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ شک کے ساتھ سنی جاتی ہے۔

معترضین کی تضاد بیانی

ہندوستان کے مسلم فرماں رواؤں کے بارے میں معترضین کے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آخر ان فرماں رواؤں کا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ ایک ہی وقت میں متضاد کیوں کر ہوسکتا ہے۔یا تو انہوں نے ہندوستان میں ظلم و بربریت کی روش اختیار کی ہوگی یا پھر انسانی ہمدردی اور رواداری کے اصولوں کو اپنایا ہوگا۔لہٰذا ان بیانات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے متعلق بیش تر مورخوں نے تعصب سے کام لے کر پوری تاریخ کو مشکوک بنادیا ہے۔چنانچہ جس اورنگ زیب کو

سر جادوناتھ سرکار نے 'شجرِ اسلام کا ایک کڑوا پھل' کہا ہے، اس کی دوسری رائے اورنگ زیب کے متعلق یہ بھی ہے:

''جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنالیا تھا اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات، معرفت ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا۔ بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا۔ اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کر دیں جن کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ لکھا، تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ ایک مشغول حکم راں ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا۔ اس کے کثیر رقعات، اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہیں، کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالم گیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے ساتھ منسوب ہے اور جس نے بعد کے عہد میں اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کر دیا۔'' [۱۰]

یہی مورخ محمد بن قاسم کی فتوحات اور ان کی سیاسی بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شروع کے عرب فاتحوں خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقل مندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے۔ جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کے ہوتے، ورنہ پھر ان

کو جزیہ ادا کرنا پڑتا، جس کے بعد ان کو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی اجازت ہوتی۔''[۱۱]

سر جادوناتھ نے مجموعی طور پر تمام مغل حکم رانوں کی پالیسی اور ان کے انتظام مملکت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''مغل ایمپائر کے سبھی صوبوں پر بالکل ایک ہی طرح انتظامی مشنری کے ذریعہ ٹھیک ایک ہی طرح کے ضابطوں اور سرکاری خطابوں کے ساتھ حکومت ہوتی تھی۔ فارسی واحد زبان تھی جو سرکاری ریکاڈس، فرمان، اسناد، زمینوں کے عطیات، حمل ونقل کے اجازت ناموں، مراسلات اور رسیدوں کے اجرا میں استعمال ہوتی تھی۔ صرف ٹکسال شہروں کے ناموں کے فرق کے ساتھ ایک ہی نام اور نوعیت کے اور کھرے پن میں ایک ہی طرح کے سکوں کا حامل، ایک ہی طرح کا مالیاتی نظام سلطنت بھر میں رائج تھا۔ عہدہ داروں اور فوجیوں کو برابر ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک صوبہ کا باشندہ اپنے کو کسی دوسرے صوبے میں تقریباً گھر ہی کی طرح مطمئن محسوس کرتا تھا۔ تجار اور سیاح بڑی آسانی سے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آتے جاتے رہتے تھے اور سبھی اس ملک کی شاہی (سیاسی) وحدت کو خوب سمجھتے تھے۔''[۱۲]

کیمبرج ہسٹری کے مصنف نے اپنی دوٹوک رائے اس انداز میں پیش کی ہے:

''مسلم مورخین نے کسی بغاوت کو فرو کرنے یا کسی قلعہ، شہر یا گاؤں پر قبضہ کرنے میں، انہیں جلانے اور پورے ضلع کو برباد کر دینے کا واقعہ اس رجزیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ثبوت نہیں ہوتا کہ واقعہ اس طرح ہو ہی نہیں سکتا تو ہم ان سے مغالطہ میں پڑ جاتے اور یقین کرنے لگتے کہ شمالی ہندوستان پر مسلمانوں کا ابتدائی غلبہ ایک ایسا مقدس جہاد تھا جو بت پرستی کو ختم کرنے اور اسلام کی تبلیغ کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ محمود اور اس کے بعد سبھی حکم رانوں نے جب بھی ایسا کرنا اپنے حق میں موزوں سمجھا، ہندو جاگیرداروں اور زمین داری کی اطاعت کو قبول کرلیا، انہیں اپنا منصب دار بنایا اور ان کے موروثی علاقوں کو ان کے قبضے میں رہنے دیا۔''[۱۳]

الفسٹن نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی اپنائی تھی اور مسلمانوں کو

ہندوؤں کا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف ٹھہرایا تھا اور پھر اپنے نظریات کو کتابی شکل دے کر اسکول کے نصاب میں شامل کر دیا تھا۔ مگر وہ بھی مسلمان حکم رانوں کے انصاف، مواخات اور رواداری کا اعتراف کرتا ہوا نظر آتا ہے:

''ان (مسلمانوں) کی حکومتوں میں ہندوؤں کے مندروں اور دھرم شالاؤں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ برندابن، گوردھن اور متھرا کے مندروں کو شاہی خزانے سے مدد کی جاتی تھی۔ متھرا ضلع کے گوردھن میں ہری دیو جی کا مندر ہے۔ یہ ۱۵۰۰ء میں بنا۔ احمد شاہ کے ایک دستخطی فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کی اور سے مندر کے خرچ کے لیے روپیہ ملتا تھا۔''[۱۴]

ڈاکٹر ایشوری پرساد سابق پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی محمود کی عسکری اور سیاسی بصیرت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ میں محمود کا مقام طے کرنا مشکل کام نہیں۔ اپنے زمانے کے مسلمانوں کے سامنے وہ غازی اور دین کا حمایتی تھا، جس نے مشرکوں کے ملک سے بت پرستی ختم کرنے کی کوشش کی اور آج کے ہندوؤں کی نگاہ میں وہ ایک وحشی اور ظالم حقیقی ہوا تھا، جس نے ان کی انتہائی مقدس عبادت گاہوں کو برباد کیا اور وحشیانہ طور پر ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کیا۔ لیکن ایک غیر جانب دار محقق جو اس زمانے کے خصوصی حالات کو دھیان میں رکھے گا تو لازمی طور پر دوسرا فیصلہ دے گا۔ محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک عظیم رہ نما تھا۔ وہ اپنی عقل سے کام کرنے والا معقول اور ایمان دار حکم راں، ایک جری اور لائق سپاہی، منصف مزاج، ادب کا سرپرست اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں شمار کیے جانے کے لائق تھا۔''[۱۵]

ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے لیے سلاطینِ ہند کے فرامین

مسلم سلاطین ہند نے غیر مسلموں کے ساتھ جو رواداری برتی اور ان کے مذہبی مقامات کے سلسلے میں جو مثبت رویہ اپنایا وہ ہر شک وشبہ سے بالا تر ہے۔ انہوں نے اپنی سلطنت میں دیگر غیر مذاہب کے ماننے والوں کی عبادت گاہوں کے لیے بڑی تعداد میں

آراضی وقف کیں، تاکہ ان کی آمدنی سے ان عبادت گاہوں کا نظم ونسق اچھی طرح انجام پاسکے۔ اورنگ زیب نے تو کچھ مندروں کے لیے گھی اور تیل بھی مہیا کرایا، تاکہ شام ہوتے ہی انھیں روشن کیا جاسکے۔[۱۶] ایسے فرامین کی کثیر تعداد ہے جو ملک کے مختلف مقامات کے مندروں کے پروہت اور ان کے اہل خاندان کے پاس آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے فرامین کو بشمبر ناتھ پانڈے نے مختلف مقامات سے حاصل کرکے اور بڑی چھان بین کے بعد اپنی کتاب میں شائع کردیا ہے۔[۱۷] ان فرامین کے مطالعہ سے متعصب مورخوں کا تعصب واضح ہوجاتا ہے۔ یہ ان برادران وطن کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو مسلمان فرماں رواؤں کو بدنام کرتے ہیں اور انہیں ظالم وجابر کہنے میں ذرہ برابر بھی عار محسوس نہیں کرتے۔

مندروں کے انہدام کی حقیقت

مسلمان حکم رانوں پر مندر شکنی کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس سے متعلق بعض واقعات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ سے اس مسئلہ کو اچھالنے کی جو مہم چھیڑی گئی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ کچھ معاصر مورخین کے خلاف واقعہ اور غیر محتاط بیانات کی وجہ سے بھی غلط تاثرات ابھرتے ہیں۔ برطانوی مورخین اور خود ہندوستانی مورخین واہل قلم کے ایک طبقہ نے اس زمانہ کے مزاج یا درباری مورخین کے انداز تحریر کو دانستہ یا نادانستہ اس باب میں مسلم حکومتوں کے طرز عمل کی ترجمانی قرار دیا ہے، یا اس سے متعلق واقعات کو ان کے پس منظر سے الگ کرکے مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ نہ صرف علمی بددیانتی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی بدترین مثالیں ہیں، بلکہ ملک میں سماجی تعلقات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی بہت خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جن مندروں کا ذکر کیا جاتا ہے اگر ان کو منہدم نہ کیا جاتا تو ملک میں مزید بے حیائی اور بدامنی اور خلفشار پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ کیوں کہ اس عہد میں ایسے کئی مندر تھے جو بے حیائی کا اڈہ بن گیے تھے اور مفسد لوگ یہاں جمع ہوکر حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر ایشورٹو پانے لکھا ہے:

''اسلامی اصولوں کے نقطۂ نظر سے غیر مسلم ذمی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ نئے مندر نو آباد مسلمانی علاقوں میں تعمیر کرتے۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نئے شہر آباد کیے تھے، یہاں ہندوؤں نے مندر بنائے۔ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑے گئے۔ ان مندروں کے متعلق فتوحاتِ فیروز شاہی میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان تیوہاروں کے موقعہ پر، جو ان مندروں کے سلسلے میں ہوا کرتے تھے، جاتے تھے اور عورتوں کا بھی کثرت سے ان جگہوں میں آنا جانا ہوتا تھا۔ مرد اور عورت کے ملنے جلنے کی وجہ سے پبلک میں عام رسوائی کے چرچے ہوا کرتے تھے اور بد اخلاقی پھیلتی جاتی تھی۔ یہ مندر دراصل عقیدت اور مذہبیت کے گھر نہ بن سکے، بلکہ شیطان کا وہاں راج تھا۔ فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسرے پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر توڑے۔''[۱۸]

اس طرح کے واقعات دوسرے عہد میں بھی ہوئے، جس کے خلاف بادشاہوں کو سخت کارروائی کرنی پڑی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ''جنگ کے دوران عبادت گاہوں کی بربادی ایک عام بات تھی۔ لیکن جب صلح کی صورت پیدا ہو جاتی تو ان عبادت گاہوں کی تخریب سے ہاتھ روک لیا جاتا تھا۔''[۱۹]

سلطان سکندر لودھی بھی مذہبی معاملات میں سخت واقع ہوا تھا، مگر اس نے تعصب سے کام نہیں لیا۔ اگر اس نے کسی قدر غیر مسلموں کے ساتھ سخت رویہ اپنایا تو اس کے عوامل پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اس عہد میں ہندوؤں کی بعض ایسی جماعتیں سرگرم ہو گئی تھیں جن کا مقصد مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔[۲۱] دوسری طرف یہی بادشاہ یہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے علوم کو سیکھیں، تاکہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔[۲۱] اس نے اگر تعصب سے کام لیا ہوتا تو کروکیشتر کے کنڈ کو تباہ کر دیتا، مگر مولانا عبداللہ اجودھنی نے اسے اس کام سے روکا تو وہ آگے کوئی اقدام نہ کر سکا۔[۲۲]

بعض وجوہ سے جہاں گیر نے نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی لگا دی تھی، اس

لیے شاہ جہاں نے اپنے زمانہ میں نوتعمیر شدہ مندروں کو مسمار کروادیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی کئی مندر گروائے۔ مسلمان حکم رانوں نے ہنگامی حالات میں بعض مندروں کو مسمار کیا تو انہوں نے کچھ مسجدوں اور درگاہوں کو بھی تہس نہس کیا۔ اگر وہ تعصب کو جگہ دیتے تو ملک میں ایک بھی مندر بچا نہ رہتا۔ انہوں نے اسلام کے اس اصول پر عمل کیا کہ کسی کے مذہبی مقامات کو محض نفرت اور عناد کی وجہ سے ہرگز مسمار نہ کیا جائے، البتہ جو مقامات سازش اور گم راہی کے اڈے ہوں انھیں برباد کردیا جائے۔

جزیہ کا نفاذ

جب کسی نئے علاقہ کو فتح کرکے مسلمان اس پر اقتدار حاصل کرلیتے ہیں تو مفتوحین میں سے جو لوگ مسلمانوں کی حکومت تسلیم کرکے اس ملک میں رہنا چاہیں اور عہد کریں کہ وہ مملکت کے خلاف بغاوت اور سازش میں ملوث نہ ہوں گے، ان کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کرکے حکومت ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی بالکل اسی طرح حفاظت کرتی ہے، جس طرح مسلمان رعایا کی کرتی ہے۔ البتہ ایسے لوگوں سے مسلمان حکم راں کچھ سالانہ ٹیکس لیتے ہیں، اسے جزیہ کہا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس انہی لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور اور مذہبی خدام وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ جزیہ کی ادائیگی کے بعد اہل ذمہ سے نہ صرف فوجی خدمات ساقط ہوجاتی ہیں، بلکہ وہ اپنے مذہبی، سماجی اور عائلی معاملات میں بھی اسلامی قانون کے پابند نہیں ہوتے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے محمد بن قاسم کے زمانہ میں، جب وہ سندھ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈال رہے تھے، یہ مسئلہ پیش آیا کہ مفتوح قوم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا جائے اور شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے، کیوں کہ یہاں کے باشندے شبہ اہل کتاب تھے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کی شرعی حیثیت کے بارے میں مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں جہاں تک ہندوؤں کی حیثیت کا تعلق ہے، یہ مسئلہ سب سے پہلے اس وقت زیر بحث آیا

جب عظیم فاتح محمد بن قاسم کے زیر قیادت سندھ میں ۷۱۲ء میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ سندھ کے ایک مستند ماخذ چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ کے ان مفتوحین (جن میں برہمن، بودھ دونوں شامل تھے) کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اوران پر جزیہ عاید کیا، جنھوں نے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہتے ہوئے مسلم حکومت کے زیر نگیں رہنے پر رضامندی ظاہر کی ۔اسی حیثیت سے انہیں مذہبی آزادی ملی اور قدیم مندروں کی مرمت و آبادکاری کی اجازت دی گئی۔گرچہ چچ نامہ یا کسی اور ماخذ میں اس کی صراحت نہیں ملتی ،لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ محمد بن قاسم نے والیٔ عراق اور علماء سے صلاح ومشورہ کے بعد ہی ہندوؤں کے سلسلہ میں فیصلہ لیا ہوگا، جیسا کہ اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ انہیں قدیم معابد کی مرمت کی اجازت دینے اور بعض دوسرے مسائل میں محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے مشورہ اور علماء سے استفسار کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مشہور عرب مورخ بلاذری نے صاف طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ سندھ کی فتح کی مہم کے دوران اور بعد کے زمانوں میں بھی حجاج بن یوسف سے محمد بن قاسم کی مراسلت برابر جاری رہی اور یہ صراحت بھی کی ہے کہ ہر تیسرے روز خطوط کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔'' ۲۳

سندھ کے غیر مسلموں کی جو شرعی حیثیت متعین کی گئی، اسی قانون پر بعد کے سلاطین نے بھی عمل کیا، اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا رہا۔البتہ اکبر کے زمانہ میں شروع میں تو اس پر عمل رہا، مگر بعد میں اس نے ہندوؤں کو اس سے بری کردیا۔عہدِ جہاں گیر اور شاہ جہاں میں بھی جزیہ معاف رہا۔البتہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے بائیس سال بعد اس قانون کو نافذ کردیا اور اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل اسے موقوف کردیا۔ اسلام کے اصول جزیہ پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تقریباً آٹھ سو سال تک رہی اور زیادہ تر زمانوں میں جزیہ وصول کیا گیا، اس کے باوجود عہد قدیم سے چلے آئے مذہبی معتقدات

اور مذہبی مقامات کی اپنی حیثیت برقرار رہی۔اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جزیہ کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مذہب کی تبدیلی کا عمل ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسلام کے شیدائی اس کا بیان بڑھا چڑھا کر کرنے سے باز نہ رہتے۔'' ۲۴

غیر مسلموں سے سربراہ مملکت سالانہ جزیہ کی ایک قلیل مقدار ہی وصول کرتا تھا، اس کے برعکس مسلمانوں کو صدقہ، زکوٰۃ اور عشر ادا کرنا پڑتا تھا، جو جزیہ سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ دراصل جزیہ ایک طرح کا بدل تھا جس کے ادا کرنے کے بعد ذمی تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتے تھے اور ساتھ ہی ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سربراہ مملکت پر عائد ہو جاتی تھی۔اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر اور کئی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ ایک تو انہیں جنگ میں حصہ لینا پڑتا، تو دوسری طرف انہیں سرحد کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ آج بھی حکومت ملک میں رہنے والی ہر قوم سے سالانہ ایک متعین رقم وصول کرتی ہے۔ دراصل اس قسم کی رقم حکومت وصول نہ کرے تو پھر ملک کا نظم و نسق چلانا مشکل ہو جائے گا۔

جزیہ کی جو مقدار متعین کی گئی ہے اور جس کی تفصیل کتابوں میں ملتی ہے، اس کے مطابق محمد بن قاسم نے ہندو رعایا سے وصول کیا اور اسی اصول پر اورنگ زیب کے عہد تک عمل ہوتا رہا۔ یہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ اسلام سے قبل بھی اس طرح کی رقم شاہان وقت اپنی رعایا سے وصول کرتے تھے۔اگر یہ معمولی سا ٹیکس ادا کر کے لوگ تبدیلی مذہب کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اس مذہب کی کمی ہے نہ کہ شاہانِ اسلام کا جبر۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی مقدار اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیے، کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے۔'' ۲۵

نفاذ جزیہ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ محمد بن قاسم، علاء الدین خلجی، فیروز شاہ تغلق اور اورنگ زیب عالم گیر کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے زبردستی غیر مسلموں پر جزیہ کا قانون نافذ کیا، جس سے ہندوؤں کی مالی حالت کمزور اور مسلمانوں کی حالت مستحکم ہوگئی۔ یہ برادران وطن کی غلط فہمی ہے کہ وہ جزیہ کی اصل غرض وغایت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے:

''اورنگ زیب نے باتفاق جمیع علماء حنفیہ ہند ہندوؤں پر جزیہ کے احکام جاری کیے تھے۔ نادانی و بے خبری سے ہندوؤں نے سمجھا کہ یہ ان کی تذلیل وتحقیر ہے، حالاں کہ اگر اس وقت علماء محققین ہوتے اور وہ جزیہ کی غرض و غایت اور اہل ذمہ کے حقوق معتبر فی الشرع کو کھول کر بیان کرتے تو ہندوؤں کو معلوم ہوجاتا کہ ان کی تذلیل نہیں، بلکہ وہ بہتر سے بہتر سلوک ہے جو دنیا میں کوئی حاکم قوم محکوموں کے ساتھ کرسکتی ہے''۔ ۲۶

مسلم حکم رانوں کے عہد میں غیر مسلموں کے درمیان یہ ٹیکس کبھی خلجان کا باعث نہ رہا اور نہ ان لوگوں نے اسے اپنے لیے بار سمجھا، بلکہ انہوں نے اسے بخوشی قبول کیا، کیوں کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کے تعاون کے بغیر حکومت کا کاروبار اچھی طرح سے چلایا نہیں جاسکتا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن فرماتے ہیں:

''اس زمانہ کے تمام راجہ اس کو اور ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس سمجھ کر ادا کردیا کرتے تھے اور کسی حال میں وہ اپنے کو کمتر درجہ کا شہری تسلیم نہیں کرتے تھے، حالاں کہ اب یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلموں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر گری ہوئی حالت میں رکھنے کے لیے عائد کیا جاتا تھا۔ مگر جب ہاتھ میں تلوار موجود تھی تو ایسا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی کیا ضرورت تھی اور ایسے مورخ کی کوئی وقعت نہیں ہوگی جو یہ تسلیم نہ کرے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تلوار تو خوب چمکی لیکن ملک داری میں ان کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہی۔ وہ میدان جنگ میں خواہ کیسی ہی خوں ریزی کرتے، لیکن جنگ کے بعد معتدل روش اختیار کرلیتے۔ کیوں کہ ملک کی زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اونچے عہدے دار تو مسلمان ضرور تھے،

لیکن دوسرے تمام عہدے ہندوؤں کے ہاتھوں ہی میں ہوتے تھے، کیوں کہ ان کی مدد کے بغیر حکومت کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا اور اگر ان کے ساتھ رودارانہ سلوک نہ کیا جاتا تو تھوڑی تعداد اور قلیل فوج کی مدد سے ہر جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔'' ۲۷

سلاطین ہند نے غیر مسلموں کی نہ صرف طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی، بلکہ بحیثیت ذمی ہونے کے سلطنت کے اہم عہدے ان کے سپرد کردیے تھے۔ناواقف ہندو کہتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص تھی۔یہ بالکل غلط ہے۔جہاں گیر، شاہ جہاں یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ہندو اہم عہدوں پر فائز تھے۔نہ ہزاری، ہفت ہزاری، چار ہزاری جیسے عہدے ان کو ملے ہوے تھے، جو فوجی عہدہ تھا۔یعنی ہر منصب کی تعداد کے اعتبار سے فوج ان کے زیر نگرانی حرکت کرتی تھی۔ ۲۸

عہد فیروز شاہی میں بھی ہندو بہت معزز ہو گیے تھے۔خود فیروز شاہ تغلق نے اپنی حکومت کو ہر قسم کے ضعف سے محفوظ رکھنے کے لیے ہندوؤں کو قریب کیا۔بعض اوقات وہ ہندو جوگیوں اور بیراگیوں کو اپنے پاس بٹھاتا اور ان سے علمی مذاکرہ کرتا تھا۔ خسرو خان نمک حرام اور خسرو خانی ہندوؤں نے اندر اندر اسلام دشمنی کا جو مظاہرہ کیا اس پر بھی سلاطین نے کوئی سخت نوٹس نہیں لیا۔ حد سے زیادہ بڑھی ہندو نوازی کا ذکر انگریز مورخوں نے بھی کیا ہے۔ پروفیسر گارڈ براؤن نے لکھا ہے:

''رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سوان پر سختی وسخت گیری کیسی؟ اس (محمد تغلق) نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا، دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلی ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت وثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی۔ برنی کا زرفرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی وتونگری میں ترقی ہوتی رہی، اس نے قدیم وجدید ہندو ریاستوں کو نیم خود مختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا۔ اس کے طرز عمل کی دانش مندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں۔'' ۲۹

اسلام کی اشاعت طاقت اور اقتدار کے بل پر نہیں ہوئی

مسلم سلاطینِ ہند نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیا اور انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ اگر اسلام جبر سے پھیلایا جاتا تو مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہوتے ہی وہ سارے ہندو جنہوں نے جبراً اسلام قبول کیا تھا، اسلام سے پھر جاتے اور اپنے سابق مذہب کو اختیار کر لیتے۔ مگر تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ملتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی اس سے منحرف ہوا ہو۔ اگر جبراً اسلام پھیلایا جاتا تو آگرہ، دہلی، اودھ، بہار، دکن وغیرہ میں مسلمانوں کی تعداد ہرگز کم نہ ہوتی، کیوں کہ یہ علاقے براہ راست مرکز سے تعلق رکھتے تھے۔ آٹھ سو برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہاں مسلمانوں کی تعداد پندرہ فی صد سے زیادہ نہ بڑھی۔ اس کے برخلاف جہاں مسلمانوں کا اقتدار زیادہ مضبوط نہ تھا، ان علاقوں میں ان کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا۔ سندھ، کشمیر اور بنگال وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں آرنلڈ نے بڑی تفصیلی اور اہم بحث کی ہے۔ مگر یہاں پر 'اے شاٹ ہسٹری' کا مندرجہ ذیل اقتباس جو بڑا ہی معنی خیز ہے پیش کیا جا رہا ہے:

''ظن غالب یہ ہے کہ ہندومت کی پابندیوں نے بنگال کی نیچ ذاتوں کو اس نئے مذہب کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک بنگال پر پال خاندان کی حکومت تھی، جو بدھ کا پیرو تھا۔ اس کے زمانہ میں نیچ ذاتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی۔ جب سین خاندان کے لوگ جنوب کی طرف بنگال میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ہندومت اور اس کی تمام معاشرتی پابندیاں بھی لے آئے، جن سے نیچ ذاتوں کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگتی تھی اور جب بارہویں صدی میں اسلام آزادی اور مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال پہنچا تو عوام کی طبیعتیں خود بخود اس کی طرف مائل ہو گئیں۔ لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک بڑا سبب ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سبب کی تلاش کی حاجت نہیں''۔[۳۰]

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے اسباب وعوامل

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے وقت یہاں کے دوقدیم مذاہب ہندومت اور بدھ مت کے درمیان کش مکش جاری تھی۔جس میں بدھ مت کودوبارہ عروج حاصل ہورہا تھا۔ ان مذاہب کے رہ نما سماجی تفریق کے ناسور کا مداوا پیش کرنے سے قاصر رہے۔اگراس طرح کی برائے نام کوشش کی بھی تو اس میں انہیں کوئی کامیابی نہ مل سکی۔اس کش مکش اور سماجی تفریق کا عوام بالخصوص سماج کے پچھڑے طبقہ پر کافی اثر پڑا۔اسی درمیان اسلام اپنی صاف ستھری تعلیمات لے کر ان کے سامنے کھڑا ہوا تو عوام کونظر آیا کہ اسلام نے جو نظریۂ حیات پیش کیا ہے، اس میں بلاتفریق رنگ ونسل سب برابر ہیں۔لہٰذا وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی آغوش میں آتے چلے گئے۔اب کوئی اونچی ذات کا ہندو کسی نائر سے چھوجانے اور غسل کیے بغیر کچھ کھاپی لینے کے جرم میں غریب الوطنی ،قید اور غلامی کی صعوبتیں اٹھانے کے لیے مجبور نہ تھا۔درحقیقت اسلام کی اشاعت میں مندرجہ ذیل اسباب عوامل کارفرما تھے:

۱۔ عرب تجار کی تبلیغی مساعی۔

۲۔ سلاطین کا پے درپے ہندوستان پر حملہ اوران کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کا یہاں کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک۔

۳۔ علماء کی تدریسی ،تقریری اورتحریری خدمات۔

۴۔ صوفیاء کرام کی جدوجہد۔

۵۔ انسانی مساوات کا اسلامی عقیدہ۔

۶۔ ذات پات کی تفریق سے نفرت وبیزاری۔

ان میں سے ہر عامل نے اپنے اپنے طور پر نمایاں کردار ادا کیا ہے۔لہٰذا یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ نہیں ہوئی، بلکہ ان سب عوامل واسباب نے مل کر ہندوستانی سماج کو متاثر کیا ، جس کے نتیجے میں اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔

سلاطینِ ہند کا عدل وانصاف اشاعتِ دین کا اہم سبب

یہ بات درست ہے کہ سلاطینِ ہند علماء، صوفیاء اور مشائخ کی طرح دینِ اسلام کے نمائندے نہ تھے، مگر اس سے بھی مفر نہیں کہ ان کا ہر اقدام دین کے منافی نہ تھا، یا ان کا فکر کلی طور پر اسلام کے اصول ومبادی سے متضاد ومتصادم نہ تھا۔ اگر ان سلاطین میں بہت سے نااہل تھے تو بڑی تعداد ان بادشاہوں کی ہے جو دینی روح سے مزین اور عدل پرور تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی اس کو مغل بادشاہوں نے اور بھی شاندار طریقے پر برقرار رکھا..... مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے، جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہوکر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا، دربار کے عہدے دار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا اور پھر مناسب کارروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدے دار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا..... اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے، انہوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا، لیکن یہاں کے غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے اور مسلمانوں کو بھی اوامر ونواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی، لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی اور ان کی معاشرتی زندگی کو درہم برہم نہیں کیا..... بعض فرماں رواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن نئی تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہو رہے ہیں۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ یوپی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا اور جبری اشاعتِ اسلام نہیں ہوئی اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گیے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں

کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں۔اس رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔صوفیہ کرام نے خدمتِ خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہنچی .....''[۳۱]

ہندوستان میں اشاعت اسلام کی تاریخ پر ایک نظر

عام رجحان یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین نے ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔متعصب مورخوں نے اس کے برعکس یہ باور کرایا ہے کہ انہوں نے جبراً اسلام کو پھیلایا۔'پریچنگ آف اسلام' کے مصنف آرنلڈ نے اشاعت اسلام کا پورا سہرا صوفیہ کے سر ڈالا ہے۔[۳۲] عصر حاضر کے کچھ محتاط مورخوں نے اپنی تمام بحث اس بات پر مرکوز کر دی ہے کہ اسلام کی اشاعت صوفیۂ کرام کی ترجیحات یا عمومی ذمہ داریوں سے خارج تھی۔انہوں نے اس سلسلے میں کوئی عملی جدوجہد نہیں کی۔[۳۳] اسی طرح بعض حضرات نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں علماء نے کوئی نمایاں سرگرمی نہیں دکھائی، ان کا دائرہ کار صرف تعلیم وتعلم اور تحریر وتصنیف رہا ہے۔دین کی تبلیغ کم از کم قرون وسطی کے برصغیر کی حد تک ان کے فرائض اور کاموں میں شامل دکھائی نہیں دیتی، البتہ کہیں کہیں چند مثالیں مل جاتی ہیں جو انگلیوں کے پوروں پر گنی جاسکتی ہیں۔[۳۴]

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین، صوفیہ، علماء، عرب تجار اور کسی حد تک عام مسلمان بھی شامل ہیں اور سبھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اس کام کو انجام دیا ہے۔سلاطین نے ملک فتح کر کے یہاں کے باشندوں کو ایک مرکز سے جوڑا اور مسلمانوں کو ان کے درمیان رہنے کا موقع فراہم کیا۔ان کی معاشرت، تہذیب اور عادات و اطوار سے مقامی باشندے متاثر ہوئے اور اس طرح گاہے بہ گاہے وہ اسلام قبول کر کے مسلم معاشرہ میں ضم ہو گیے۔دوسری طرف ان بادشاہوں نے جب کسی علاقہ پر فتح حاصل کی تو ان کے سامنے قبول اسلام کی پیش کش رکھی جس کو بہت سے ہندوؤں نے قبول کیا۔اس کے بعد پھر یہی سلاطین مقامی باشندوں کو اعزاز واکرام سے

نوازتے جس کے اچھے اثرات پڑے، اس کی آخری شکل حلقۂ اسلام میں شمولیت تھی۔ اگر مسلمان ہندوستان میں سیاسی افق پر کم زور ہوتے تو بقول ایک ہندو دانش ور ''یہ بھی امکان تھا کہ ہندی ادیان کے گھنے جنگل میں اسلام کی شخصیت ہی گم ہوجاتی، قطع نظر اس کے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوتی؟'' ۳۵

اگر یہ تمام باتیں نہ ہوتیں تو پھر صوفیۂ کرام جو سلاطین وقت سے الگ تھلگ ہوکر دین کی دعوت کو عام کیے ہوئے تھے، کیسے اور کیوں کر یہاں آتے اور یہاں کے لوگ کیوں کر انہیں قال اللہ وقال الرسول کی آواز بلند کرنے کی اجازت دیتے۔ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں ایسے واقعات بکھرے پڑے ہیں کہ ان پاک نفوس کی برکت اور ان کی مساعی سے بے شمار لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ سید عابد حسین نے صوفیۂ کرام اور مبلغین عظام کے تبلیغی مشن کے سلسلے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے وہ بجا معلوم ہوتا ہے:

''حضرات صوفیا نے اپنے طور پر اس کام کا بیڑا اٹھایا، مگر ان کی راہ میں بڑی مشکلیں حائل تھیں۔ ملک کا نہایت وسیع اور زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قریوں پر مشتمل ہونا، جو بعض علاقوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے، آمد و رفت کی دشواریاں، بدامنی، جنگ وجدل، اس کے علاوہ ہندو مذہب کی جڑیں مضبوطی سے لوگوں کے دلوں میں قائم تھیں، اگر چہ مسلمانوں کا معاشرتی نظام، جس میں ابھی تک اخوت ومساوات کا کچھ رنگ باقی تھا، ہندوؤں کے نچلے طبقے کو اپنی طرف کھینچتا تھا، لیکن ان کی قدامت پسندی اور وہ وحشت جو اجنبی فاتح قوم سے ہوا کرتی ہے انہیں روکتی تھی۔ اونچے طبقے عموماً اپنے مذہب سے مطمئن تھے اور اپنی سماجی حالت سے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ صوفیوں کی جماعت نے ان ناسازگار حالات میں عام طور پر بغیر حکومت کی مدد کے محض اپنے جوش ایمانی سے تبلیغ کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔ لاکھوں کروڑوں ہندو جن میں اونچے طبقے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے، مسلمان ہوگئے۔ پھر بھی مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں اس قدر کم رہی کہ ریاست کے لیے یک جہتی اور ہم آہنگی کی جو فضا درکار ہے وہ پیدا نہ ہوسکی۔'' ۳۶

علمائے کرام نے بھی یقیناً خالص دینی جذبے کے تحت ہی اسلامی تعلیمات کو

ہندوستان کے کونے کونے میں عام کیا۔ دراصل یہ علماء ایک ایسی کڑی کا کام انجام دے رہے تھے جس کے تانے بانے ایک طرف سلاطینِ وقت سے ملتے تھے تو دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی خانقاہوں سے۔ مسئلہ صرف قبول اسلام تک محدود نہیں تھا، بلکہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم وتربیت اور دینی تفہیم کی بھی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو علماء کرام پورا کرتے تھے۔ اسی طرح عرب تجار نے بھی ملک کے ایک حصے میں اپنے اخلاق وکردار اور صفائی معاملات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت میں اہم کردار نبھایا۔ دراصل یہ کام ہندوستانی تناظر میں کسی ایک طبقہ کے ذریعہ ہرگز انجام نہیں پاسکتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اسلام کی اشاعت میں مذکورہ تمام طبقات نے حصہ لیا۔ ضرورت ہے کہ ان تمام لوگوں کی خدمات کا غیر جانبدارانہ طریقے سے مطالعہ کیا جائے۔

حواشی ومراجع

۱ اشاعت اسلام کے سلسلے میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ احادیث میں اس کے متعلق کیا صراحت ملتی ہے؟ خود اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کرامؓ نے تبلیغ دین کے لیے کس طرح کی حکمت عملی اختیار کی؟ پھر بعد کے عہد میں مبلغین اسلام اور خلفائے اسلام نے اسلام کو کس انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور اسے پھیلایا؟ اس کے لیے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون: 'اشاعت اسلام سے متعلق اسلامی احکام' ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مئی ۲۰۰۸ء

۱الف سید ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، طبع ۲۰۰۷ء، ص ۱۵ (دیباچہ اول)

۲ ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

۳ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۲۲..... علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کتاب اور اس طرح کی دوسری کتابوں پر جو تنقیدی ریمارک کیا ہے وہ بڑا دل چسپ ہے، اس سے مصنفین کے عزائم کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ج: ۱، ص: ۳۸۴-۳۸۵، ۳۹۰

۴ جیمس فرگیسن، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء، ص: ۱

۵ بشمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت (مترجم: تقی رحیم) خدا بخش اورینٹل

پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص:۲۹-۳۰

۶۔ محمد اسد، اسلام دوراہے پر، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص:۴۶-۴۷

۷۔ History of Aurangzib, Sir Jadunath Sarkar OrientLimited, N. Delhi,1972,Vol.3,P:163-190

۸۔ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء، ص:۴ دیباچہ

۹۔ ایضاً.....اس کے برعکس ڈاکٹر ستیش چندر کی کتاب 'مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست'، محمد اطہر علی کی 'اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا'، 'تاریخ شاہ جہاں' ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ اور رومیلا تھاپر کی کتاب کافی حد تک حقائق پر مبنی معلوم ہوتی ہیں، جن میں سلاطین ہند کی ہندو نوازیت اور دوسرے اہم گوشوں پر منصفانہ مواد جمع کیا گیا ہے۔

۱۰۔ History of Aurangzib,Vol:5,P:474 بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ج:۱، ص:۲۲۲

۱۱۔ History of Aurangzib,Vol:3 P:253 بحوالہ بزم تیموریہ، ج:۱، ص:۲۲۲

۱۲۔ مغل ایڈمنسٹریشن، ص:۱۲۹-۱۳۰، بحوالہ: اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۰

۱۳۔ ہسٹری آف انڈیا، ص:۸۳، ج:۳، بحوالہ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۳

۱۴۔ ہندوستان کی مختصر تاریخ (الفنسٹن)، بحوالہ بسمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص:۱۲

۱۵۔ ایشوری پرشاد، میڈول انڈیا، ص:۱۱۰-۱۱۱، بحوالہ اسلام اور ہندوسانی ثقافت، ص:۱۱-۱۲ .....سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکم رانوں کی مذہبی رواداری، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء، ج:۱، ص:۲۹

۱۶۔ سعید احمد اکبرآبادی، نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص:۵۷

۱۷۔ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۳-۴۵.....ایسے متعدد فرامین شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ خدا بخش لائبریری نے ایسے بہت سے فرامین کو عہد بہ عہد جمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ ہند عہد وسطی میں (مجموعۂ مقالات) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبری، پٹنہ، ۱۹۹۹ء، ص:۲۰۷-۲۷۹

۱۸۔ ایشور ٹوپا، ہندی مسلمان حکم رانوں کے سیاسی اصول، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص:۸۹

۱۹ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص: ۴۴۹
۲۰ ایضاً، ص: ۴۴۹
۲۱ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، ص: ۱۳
۲۲ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص: ۴۵۲-۴۵۳
۲۳ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، ہندوؤں کے ساتھ سلطان فیروز تغلق کا برتاؤ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۹۳ء، ص: ۳۸
ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ: عہد فیروز شاہی میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص: ۳۷
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: بلاذری کی فتوح البلدان، بہ ضمن فتوحات سندھ اور علی بن حامد کوفی کی فتح نامہ سندھ معروف بہ چچ نامہ
۲۴ اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر، ص: ۴۰-۴۱
۲۵ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ج: ۱، ص: ۲۳۱
۲۶ ابوالکلام آزاد، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مکتبہ ماحول، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص: ۸۴
۲۷ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، مطبع معادف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء، ص: ۴۶
۲۸ مقالات شبلی، ج: ۱، ص: ۲۲۰
۲۹ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۰ء، ص: ۴۶-۴۷، مضمون: محمد تغلق کا دور حکومت،
۳۰ اے شارٹ ہسٹری، ص: ۲۱۸-۲۱۹ ترجمہ اردو: مختصر تاریخ ہند، یوسف کوکن عمری، ص: ۲۱۸-۲۱۹
۳۱ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص: ۱۰۹-۱۱۲ (تلخیص)
۳۲ ٹی۔ڈبلو۔آرنلڈ، دعوت اسلام (مترجم: محمد عنایت اللہ) مطبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء، ص: ۲۷۱-۳۱۴
۳۳ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۱۹-۴۶
۳۴ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، برصغیر میں اشاعت اسلام، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۸۷ء، ص: ۴۵-۶۸
۳۵ این۔سی۔مہتا، ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء، ص: ۱۰
۳۶ سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۷۲-۷۳

انسانی حقوق اور فدائی حملے

اسلامی نقطۂ نظر

——————— جناب عبدالکریم عثمان

راقم نے اپنی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' (جس کے تین ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں) میں عام حالات میں غیر مسلموں سے تعلقات اور ذمیوں (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں) کے حقوق پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ، اسلامی ریاست میں انھیں کتنی مذہبی آزادی حاصل ہوگی؟ احکام شریعت کا ان پر نفاذ کس حد تک ہوگا؟ اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ جہاد کی اقسام اور ان کے احکام کیا ہیں؟ جیسے سوالات پر 'تحقیقاتِ اسلامی' میں اس عاجز کے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل کے مقالہ کے پہلے حصہ سے اس کی فی الجملہ تائید ہوتی ہے۔ مآخذ بھی بڑی حد تک مشترک ہیں۔ البتہ بعض باتیں وضاحت طلب محسوس ہو سکتی ہیں۔

مقالہ کے دوسرے حصہ میں فدائی حملوں سے متعلق بحث ہے۔ اس نام سے جو کارروائیاں سامنے آتی رہتی ہیں ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ مقالہ نگار کا بھی یہی رجحان ہے۔ حالت جنگ میں فقہاء نے بعض شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے۔ یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے۔ بہر حال اس طرح کے موضوعات پر مزید غور ہوتے رہنا چاہیے۔ (جلال الدین)

اسلام آیا تو اس نے انسانی حقوق کی پاسداری اور ادائی کا ایک نظام بھی اپنے دور آغاز سے ہی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قبل از اسلام 'متوازن انسانی حقوق' کے کسی نظام

سے انسانی معاشرہ واقف نہ تھا، اندھیر نگری کا یہ عالم تھا کہ تمام حقوق قوت وطاقت کی بنا پر طے کیے جاتے تھے، اور ان کے مطالبہ وادائیگی کی مہم بھی اسی بنیاد پر چلائی جاتی تھی، گویا حقوق کی جنگ میں ہمیشہ حق پر، صاحب قوت وطاقت ہی ہوا کرتا تھا۔ کمزور اور ناتواں کا کسی چیز کا محض مطالبہ کرلینا بھی جرم تھا، غلام تو غلام آزاد انسانوں کی خرید وفروخت تک کرنے سے دریغ نہ ہوتا تھا۔ عورت معاشرہ میں بدنامی ورسوائی کا بدنما داغ سمجھی جاتی تھی۔

ہمارے پیش نظر اس وقت خاص طور پر غیر مسلموں کے حقوق کا مطالعہ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل اسلامی احکام کا حاصلِ مطالعہ اور خلاصہ پیش کیا جائے گا اور اسی پس منظر میں 'فدائی حملوں' سے بھی بحث ہوگی:

۱۔ عمومی حالات میں غیر مسلموں کے حقوق

۲۔ حالت جنگ میں انسانی حقوق

۳۔ انسانی حقوق کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں 'فدائی حملوں' کا جواز وعدم جواز

عام حالات میں غیر مسلموں کے حقوق

'عام حالات' سے مراد یہ ہے کہ حالت امن میں اور عدم حالت جنگ میں اسلام نے غیر مسلموں کو کیا حقوق دیے ہیں؟

اسلام کی تعلیمات کی وسعت وہمہ گیری کی بنا پر خاص اس موضوع پر اس قدر تفصیلی احکام موجود ہیں کہ ان کے بیان کے لئے ایک مکمل ومستقل کتاب درکار ہے، علامہ ابن القیم الجوزیؒ نے 'احکام اہل الذمۃ' کے نام سے ایک ضخیم کتاب دوجلدوں میں (ایک ہزار پینسٹھ (۱۰۶۵) صفحات پر مشتمل) لکھی ہے، جس میں غیر مسلموں کی مذہبی، معاشی، معاشرتی آزادی اور ان کے حقوق کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اسکے علاوہ بھی بہت سی کتب اس موضوع پر موجود ہیں۔

ذیل میں نمونہ کے طور پر غیر مسلموں کے صرف ان حقوق کو ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جو زیر بحث موضوع سے متعلق ہیں۔

غیر مسلموں کی معاشرتی آزادی اور ان کی عصمت وآبرو کا تحفظ

ہر انسانی معاشرہ میں عزت وآبرو کی حفاظت بنیادی اہمیت رکھتی ہے ،جس معاشرہ میں انسانوں کی عزت وآبرو ہی محفوظ نہ ہو وہ اپنی تمام تر مادی ترقیوں کے باوجود انسانی معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں۔

اسلام نے غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی حفاظت کا جو بندوبست کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی مسلم کسی ذمیہ یامستأ منہ (غیر مسلمہ) کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرلے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے:

لم یشترط الفقهاء لوجوب حد الزنیٰ علی المسلم أن یکون زناه بمسلمة ، انما الذی اشترطوه لإقامة حد الزنیٰ علیه هو أن یطأ الرجل امرأة محرمة علیه من غیر عقد..... فلا یباح للمسلم ان یزنی ، فاذا زنی أقیم علیه الحد سواء کان المزنی بها مسلمة أو ذمیة أومستأمنة،و مع ذالک فقد صرح بعض الفقهاء بأن المسلم اذا زنیٰ المستأمنة حد حد الزنیٰ..... [1]

فقہاء نے مسلم پر زنا کی سزا (رجم یا جلد) کے وجوب کے لئے صرف مسلمان عورت سے زنا کرنا شرط قرار نہیں دیا ہے، بلکہ انہوں نے زانی مسلم پر حد قائم کرنے کے لئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ اپنے اوپر حرام کسی بھی عورت کے ساتھ بغیر اس سے عقد (نکاح یا تملیک) کئے، جنسی عمل کرے..... لہٰذا کسی مسلمان کے لئے روا نہیں کہ وہ زنا کرے اگر اس نے زنا کیا تو اس پر ہر صورت میں حد جاری ہوگی،خواہ وہ عورت جس سے زنا کیا گیا ہے مسلمان ہو یا ذمی یامستأ منہ۔ اس کے باوجود بعض فقہاء نے تو صراحۃً کہا ہے کہ مسلمان اگر مستأ منہ (غیر مسلمہ) سے زنا کرے گا تو اس پر حد زنا قائم کی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے جس طرح مسلمان عورت کی عصمت وآبرو کے تحفظ کا بندوبست کیا ہے اور اس پر کسی بھی قسم کی آنچ نہ آنے کے لئے حدود کا نظام قائم کیا ہے وہی نظام غیر مسلم عورت کی عصمت کی حفاظت کے لئے بھی رکھا ہے۔

غیر مسلموں کے لئے شخصی آزادی

یوں تو شریعت اسلامیہ نے غیر مسلموں کو وہ تمام حقوق دیے ہیں جو کسی فرد کو انسانی معاشرہ میں رہنے کے لئے درکار ہوتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا، جیسے جان کی حفاظت، مال کی حفاظت وغیرہ۔اس کے ساتھ اسلام نے کچھ ایسے حقوق بھی بیان کئے ہیں جو اسلام کا ہی امتیاز ہے ،اور اس کی نظیر کسی مذہب و قانون میں نہیں ملتی۔مثلاً:

۱۔ نقل وحرکت کی ہر قسم کی آزادی، یعنی غیر مسلم شخص اگر کسی مسلم ملک میں مقیم ہے تو اسے ہر جگہ آنے جانے کی اجازت ہے اور اسے بیرون ملک سفر کرنے کی (کسی صحیح غرض اور ضرورت کے لئے) بھی اجازت ہے۔.....[۲]

۲۔ کسی بھی شہر میں غیر مسلم (ذمی) کو رہائش اختیار کرنے کی اجازت ہے، سوائے حرم کے اور حرم میں بھی تجارت وغیرہ (کسی صحیح غرض) کے لیے داخلہ کی گنجائش ہے، **کما قال بعض الفقهاء و منهم الحنفية**.....[۳]

۳۔ کسی مسلمان کو ہرگز اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ بلا کسی شرعی وقانونی وجہ کے کسی ذمی کو قید کرلے یا اس کو کوئی سزا دے، کیونکہ اس کو بلا وجہ قید کرنا یا سزا دینا زیادتی ہے، جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

چنانچہ عام حالات میں غیر مسلموں کے حقوق پر حضور اکرم ﷺ کا ایک جامع ارشاد ہے:

من آذىٰ ذمياً فأنا خصمه و من كنت خصمه خصمته يوم القيامة.....[۴]	جس نے کسی ذمی کو (بلاوجہ) اذیت دی تو میں اسکا خصم (مدمقابل) ہوں گا اور جس کا مدمقابل میں روزِ قیامت ہوں گا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

امام ابو یوسفؒ نے اپنے زمانے میں خلیفہ وقت کو ذمیوں کے حقوق اور ان کی

رعایت کرنے کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں فرمایا:

حتی لا یظلموا ولا یکلفوا فوق طاقتھم. .....۵ — ان پر ظلم نہ کیا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لیا جائے۔

ان تعلیمات سے واضح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کی شخصی آزادی اور ان کے شخصی حقوق کا کس قدر خیال فرمایا ہے حتی کہ ایک حدیث کی رو سے اگر کوئی غیر مسلم (مستأمن/ ذمی) سے قتال کرے تو مسلمان اس کے خلاف لڑیں گے۔

غیر مسلموں کے لئے مذہبی آزادی

۱۔ اسلامی شریعت میں غیر مسلموں پر مذہبی تشدد قانونی طور پر ممنوع ہے۔ شریعت کا معروف قاعدہ ہے، ''ونترکھم وما یدینون'' (ہم ان ذمیوں کو ان کے دین کے بارے میں ان کے حال پر چھوڑتے ہیں)

ارشاد خداوندی ہے:

لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ..... (البقرۃ:۲۵۶) — دین میں اکراہ نہیں، تحقیق ہدایت کا راستہ گم راہی سے بالکل واضح ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک خط اہل نجران کے نام لکھا اس میں آپ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا:

والنجران و حاشیتھا جوار اللّٰہ و ذمۃ محمد النبی رسول اللہ علی أموالھم و انفسھم وا رضھم و ملتھم و غائبھم وشاھدھم و عشیرتھم و بیعھم و کل ماتحت أیدیھم من قلیل أو کثیر .....۶ — اور نجران اور اسکے اطراف کے لوگوں کے لئے اللہ کی طرف سے پناہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ذمہ ہے۔ ان کے مال، جان، زمین، مذہب، ان کے موجود، غیر موجود اور ان کے قبیلے کے لوگوں اور ان کی خرید وفروخت (کے معاملات) پر اور ہر اس چیز پر جو ان کے قبضے میں ہے، چھوٹی ہو یا بڑی''۔

معلوم ہوا کہ کسی غیر مسلم کو عقیدہ تبدیل کرنے پر مجبور کرنا اسلامی تعلیمات کی رو سے ممنوع ہے۔ وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بلا دا سلامیہ میں رہ سکتے ہیں۔

۲۔ مذہبی آزادی میں یہ بھی شامل ہے کہ غیر مسلموں کو اپنی عبادات ادا کرنے اور مذہبی رسوم وتہوار منانے کی اجازت ہے۔ اس سلسلہ میں فقہاء نے جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی علاقوں میں رہنے والے غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہوں کے اندر اپنی مذہبی رسوم وشعائر کو اپنانے اور قائم کرنے کی اجازت ہے اور اس سلسلہ میں ان پر کوئی پابندی نہیں، البتہ مسلم آبادیوں میں ان رسوم وعبادات کو علانیہ طور پر ادا کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کی تخفیف واہانت اور اسلامی احکام کے علانیہ مقابلہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زیدان نے فقہاء کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

" للذميين الحق في اقامة شعائرهم الدينية داخل معابدهم ويمنعون من اظهارها في خارجها في امصار المسلمين، لان امصار المسلمين مواضع اعلام الدين و اظهار شعائر الاسلام من اقامة الجمع والأعياد و اقامة الحدود ونحو ذلک فلا يصح اظهار شعائر تخالفها. ..... [1]

ذمیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہبی شعائر اپنی عبادت گاہوں میں انجام دیں، البتہ انھیں ان شعائر کو مسلمانوں کے بڑے شہروں میں اپنی عبادت گاہوں کے باہر انجام دینے سے روکا جائے گا، اس لیے کہ وہ شہر ایسے مقامات ہیں جہاں دین کا اعلان اور اسلامی شعائر کا اظہار ہوتا ہے، جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں، حدود قائم کیے جاتے ہیں وغیرہ، اس لیے وہاں مخالف اسلام شعائر کی علانیہ انجام دہی کی اجازت نہیں۔

غیر مسلموں کے لئے معاشی آزادی

انسانی حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق مختلف ذرائع معاش اختیار کرنے کی اجازت ہو، تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے

گزر بسر کا بندوبست کرے، معاشی اعتبار سے خود کفیل ہو اور کسی پر بوجھ نہ بنے۔

اس سلسلہ میں فقہاء کرام اور مفسرین نے وضاحت فرمائی ہے کہ غیر مسلم افراد معاملات، تجارات، اور دیگر تصرفات میں مسلمانوں کی طرح ہیں۔یعنی جو چیزیں ان کے مذہب کے مطابق حلال ہیں ان کی خرید وفروخت کی، (بعض شرائط کے ساتھ) اجازت ہوگی، البتہ بعض وہ چیزیں جو ان کے ہاں جائز ہیں، مگر اسلام میں ان کی ممانعت ہے۔ ان کو اس سے منع کیا جائے گا، 'ہجر' نامی علاقے کے مجوسیوں کی طرف یہ پیغام بھیجا تھا:

أما أن تذروا الربا أو تأذنوا بحرب من اللّٰہ و رسولہ ۸

کہ تم سودی معاملے کرنا چھوڑ دو ورنہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمھارے خلاف اعلان جنگ ہے۔

چونکہ سودی معاملات پورے معاشرہ کے معاشی نظام کو برباد کر دیتے ہیں اس بنا پر اسلامی ملکوں میں مقیم غیر مسلموں کو سودی کاروبار کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ جتنے بھی معاملات ہیں ان کی اپنے ماحول، علاقوں اور آبادیوں میں انجام دہی کی اجازت ہوگی۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اسلام نے بلاد اسلامیہ میں مقیم غیر مسلموں کو جان، مال، عزت و آبرو اور معاشی تگ و دو کا مسلمانوں ہی کی طرح تحفظ فراہم کیا ہے۔

اب حالت جنگ سے متعلق یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ اسلام نے اس کے کچھ اصول وضوابط مقرر کیے ہیں یا اس بات کی کھلی اجازت دے رکھی ہے کہ بے دریغ جوانسان، علاقہ یا آبادی سامنے آئے اس کو ختم اور تہس نہس کر دیا جائے۔

حالتِ جنگ اور انسانی حقوق کی رعایت

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائز جنگ وقتال کو 'جہاد' کہتے ہیں۔ اسلامی جہاد کی مشروعیت محض قتل انسانیت اور زمین میں فساد کے لئے نہیں ہوئی، بلکہ اس کا مقصد

اسلام کی دعوت، مذاہب کی آزادی، ظلم کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام ہے۔ اس مقصد کو ایک موقع پر صحابیٔ رسول ﷺ حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

اللّٰہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد اِلی عبادۃ اللّٰہ و من ضیق الدنیا اِلی سعتھا و من جور الأدیان الی عدل الاسلام فأرسلنا بدینہ الی خلقہ لندعوھم الیہ فمن قبل ذلک قبلنا منہ و رجعنا عنہ و من أبی قاتلناہ أبدًا.....۹

اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے، تاکہ جس کو وہ چاہے اسے ہم انسانوں کی غلامی سے اللہ کی غلامی میں، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت میں اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل میں لائیں۔ چنانچہ اس نے ہمیں اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا، تاکہ ہم انھیں اس کی طرف دعوت دیں۔ اب جو لوگ اسے قبول کرلیں گے ان کی بات مان کر ہم بھی واپس ہوجائیں گے اور جو لوگ انکار کریں گے ان سے آخر تک جنگ کریں گے۔

اسلام نے جہاد کے سلسلے میں ایک مکمل ضابطۂ اخلاق دیا ہے، جس کی پاسداری شرط ہے۔ اس ضابطہ اخلاق کو نظر انداز کرکے کوئی بھی جنگی اقدام قومیت اور ملک گیری کی جنگ تو ہوسکتا ہے، اسلامی جہاد نہ ہوگا۔

حالتِ جنگ میں اسلام کا ضابطۂ اخلاق

اسلام چونکہ بے جا جنگ مسلط کرنے کو پسند نہیں کرتا، بلکہ اسلامی جنگ ایک نظریاتی جنگ ہوتی ہے، اس میں نہ تو ملک گیری کی ہوس اور جذبے سے مغلوب ہوکر جنگ کی جاتی ہے اور نہ کسی ذاتی رنجش یا خالص انتقامی جذبہ کی بنیاد پر قتال کیا جاتا ہے، بلکہ مسلمانوں کی جنگ دراصل اللہ تعالی کی حاکمیت اور شریعت کے قانون کی بالادستی قائم کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَقٰتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ..... (البقرۃ:۱۹۳)

تم ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔

گویا کہ یہ بدی اور نیکی، ظلم اور عدل، فتنہ اور امن کے مابین جنگ ہے، اس لئے اس میں محض دشمن کو مغلوب کر لینے اور اس کے علاقوں پر قبضہ کر لینے سے زیادہ اہم اسلام کی ان اعلیٰ اور پاکیزہ تعلیمات کا نفاذ اور ان پر عمل درآمد ہے جو قطعی اور ابدی ہیں، اس لئے مسلمان ہر وقت اس پہلو کو مدنظر رکھتا ہے کہ اسلام نے اس موقع پر جو تعلیمات دی ہیں ان کی تکمیل ہو رہی ہے یا نہیں، اگر ہو رہی ہے تو یہی مقصود ہے۔ حالت جنگ میں بھی اور حالت امن میں بھی۔

حملہ آور ہونے سے قبل دعوت و مذاکرات کا اہتمام

تمام فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب مسلمان کسی علاقہ پر حملہ کریں یا اس کا محاصرہ کریں تو اچانک حملہ کرنے سے اجتناب کریں، بلکہ اس سے قبل ان کو دعوت اسلام دیں۔ اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان سے جنگ نہ ہوگی۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا الٰه الّا اللّٰه وأن محمدًا رسول اللّٰه و يقيموا الصلوة و يؤتوا الزكوٰة فان فعلو ذلك عصموا منى دماء هم و أموالهم الا بحق الاسلام و حسابهم على اللّٰه.....[۱۰]

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کی جان اور مال محفوظ ہوں گے۔ ان سے ناحق تعرض نہیں کیا جائے گا اور ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہوگا۔

اور اگر وہ دعوت کو ٹھکرا دیں تو پھر ان کو جزیہ قبول کرنے کی پیش کش کی جائے گی اگر اس کو بھی ٹھکرا دیں تو پھر ان سے قتال کیا جائے گا..... ۱۱

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی جنگ کا مقصد ملک گیری نہیں، بلکہ شریر لوگوں کے شر سے اللہ کی زمین کو پاک کرنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کے عادلانہ نظام کو قائم کرنا ہے، اس لئے انسانی جان کی قدر و قیمت کی وجہ سے براہ راست قتال کرنے کی بجائے پہلے دعوت کو ضروری قرار دیا گیا ہے..... ۱۲

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حالت جنگ میں بھی اسلام میں انسانی حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہے اور بغیر دعوت دیے قتال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ غیر محارب لوگوں کے قتل کرنے کی ممانعت

جہاد کا دوسرا اخلاقی اصول و ضابطہ یہ ہے کہ قتال کے دوران مندرجہ ذیل طبقات کے کسی فرد کو قتل نہیں کیا جائے گا:

۱۔عورتیں ۲۔بچے ۳۔مجنون ۴۔بوڑھے افراد ۵۔دنیا سے منقطع راہب اور عبادت گزار ۶۔مستقل مفلوج اور بیمار شخص ۷۔کفار کے قاصد اور ایلچی ۸۔جنگ سے لاتعلق زراعت پیشہ دیہاتی..... ۱۳

کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے فتنہ اور فساد کا اندیشہ نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے حالت جنگ میں بھی انسانی حقوق کی اس قدر رعایت کی ہے کہ کفار کے راہبوں، خلوت نشینوں، قتال سے لاتعلق شہریوں اور دیہاتیوں، عبادت گزاروں کو قتل کرنے سے منع کر دیا ہے، جب کہ ایسی مثال دنیا کے کسی ملک اور کسی مذہب و قانون میں نہیں ملتی۔ چنانچہ بہت سی روایات میں مندرجہ بالا نوعیت کے افراد کے قتل کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

بخاری کی روایت ہے:

عن ابن عمرؓ قال وجدت امراۃ مقتولۃ فی بعض مغازی رسول	حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کسی غزوے میں ایک عورت مقتول پائی گئی

اللہ ﷺ فنھیٰ رسول اللہ ﷺ عن قتل النساء والصبیان. ۱۴	تو رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمادیا۔

علامہ محمود بن صدر الشریعۃ بیان کرتے ہیں:

قال أبو یوسفؒ سألت أبا حنیفةؒ عن قتل النساء ، و الصبیان و الشیخ الکبیر الذی لا یطیق القتال و الذین بھم زمانة لا یطیقون القتال ، فنھی عن ذلک وکرہ ، والا صل فیہ ماروی ان رسول اللہ ﷺ رأی امرأة مقتولة فی بعض الغزوات فقال ماکانت ھذہ تقاتل فلم قتلت ، أدرک خالداً و قل لہ لا تقتلن ذریة و لا عسیفاً.....۱۵	ابو یوسف کہتے ہیں: میں نے ابوحنیفہؒ سے عورتوں ، بچوں ، بوڑھوں اور بیماروں (جو جنگ میں قادر نہیں) کے قتل کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اس سے منع کیا اور اسے ناپسند کیا۔ اس سلسلے میں اصل حکم وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے۔ کسی غزوہ میں ایک عورت کو مقتول دیکھا تو فرمایا یہ تو جنگ نہیں کر رہی تھی ، پھر اسے کیوں قتل کیا گیا۔ خالدؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ وہ کسی عورت ، بچے اور بوڑھے (یا مزدور) کو قتل نہ کریں۔

علامہ ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی اپنی معروف کتاب الفقہ الاسلامی و ادلتہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> "صرف ان جنگ جُو لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے جو براہ راست یا رائے و تدبیر سے جنگ میں شریک ہوں، دوسرے لوگوں کا قتل جائز نہیں، جیسے عورت، بچہ، مجنون، بوڑھا، مریض، معذور، نابینا، جس کے ہاتھ اور پیر مخالف سمتوں سے کٹے ہوں، یا جس کا داہنا ہاتھ کٹا ہو، یا جسے صاف نہ دکھائی دیتا ہو، راہب، گوشہ نشین، جنگ پر قدرت نہ رکھنے والے لوگ، کسان، البتہ اگر یہ لوگ قول، فعل، مشورہ یا مالی تعاون کے ذریعے جنگ میں شریک ہوں تو اس صورت میں انھیں قتل کرنا جائز ہے"۔ ۱۶

امام ابوزکریا محی الدین بن شرف النوویؒ لکھتے ہیں:

"دشمنوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا، اگر وہ جنگ میں شریک نہ ہوں، جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ آگے کہتے ہیں: راہب کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اسے نہیں قتل کیا جائے گا۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یزید بن ابی سفیانؓ، عمرو بن العاصؓ اور شرحبیل بن حسنہؓ کو شام کی طرف بھیجتے وقت فرمایا تھا: بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جو خانقاہوں میں گوشہ گیر ہوں گے، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا، اس لیے کہ ان سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر انھیں کفر اصلی پر کیوں قتل کیا جائے، وہ عورتوں کی طرح بے ضرر ہیں"۔ ۱۷

۳۔ ذمی، معاھد اور حربی کو امن دینے کے بعد قتل کرنے کی ممانعت

ذمی اسلامی ریاست کا شہری ہوتا ہے۔ ریاست اس کے جان اور مال کی حفاظت کی پابند ہے۔ کسی کو اس پر دست درازی کی وہ اجازت نہ دے گی۔ اسی طرح اگر کسی غیر اسلامی ریاست سے اس کا معاہدہ ہے کہ جب تک معاہدہ برقرار رہے اس سے جنگ نہ ہوگی۔

ارشاد خداوندی ہے:

إِلاَّ الَّذِيْنَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظَاهِرُواْ عَلَيْكُمْ أَحَداً فَأَتِمُّواْ إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ..... (التوبۃ: ۴)

بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے، پھر انھوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمھارے ساتھ کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدّت معاہدہ تک وفا کرو کیوں کہ اللہ متقیوں کو ہی پسند کرتا ہے۔

وَأَوْفُواْ بِعَهْدِ اللّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلاَ تَنقُضُواْ الأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلاً ..... (النحل : ۹۱)

اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔

ذمی اسلامی ریاست کا شہری ہے اور مستأمن کے ساتھ امن، عزت اور جان و مال کے تحفظ کا معاہدہ ہوتا ہے اس لئے اس کی خلاف ورزی سخت گناہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من قتل نفساً معاهداً لم يرح رائحة الجنة وان ريحها ليو جد من مسيرة أربعين عا ماً۔ [۱۸]

"جس شخص نے کسی ایسی جان کو قتل کیا جس سے معاہدہ ہو چکا ہو تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے بھی معلوم ہو جاتی ہے۔"

۴۔ دشمن کے مُردوں کا مثلہ کرنے کی ممانعت

جب اسلامی جہاد کا مقصد نہ انتقامی کاروائی ہے اور نہ ملک گیری کی مہم، تو اس سے ایک ضابطۂ اخلاق یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کفار (دشمنوں) کے مقتولین کا مثلہ کرنا یعنی ان کے اعضاء کی قطع و برید، جیسے ہاتھ کاٹنا، ناک کاٹنا یا آنکھیں نکال دینا وغیرہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کے کام تو وہ شخص کرتا ہے جو محض اپنا جذبۂ انتقام ٹھنڈا کرنا چاہتا ہو، جب کہ مسلمان مجاہد تو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اور زمین سے شر و فساد کو ختم کرنے کے لئے کفار کو قتل کرتا ہے۔

چنانچہ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ میں ہے:

صرح جمهور الفقهاء بأنه يحرم في الجهاد الغدر و الغلول و التمثيل بالقتلىٰ، لقوله عليه السلام : لا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا.....الى قوله: فهى العقوبة الشنيعة من مثل قطع الأنف والأذن و ونحو ذلک. [۱۹]

جمہور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جہاد میں غدّاری، مالِ غنیمت میں چوری اور مثلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرو، غدّاری نہ کرو، مثلہ نہ کرو ... چنانچہ ناک کان وغیرہ کاٹنا شنیع کام ہیں۔

یہ نمونے کے چند احکام اور آداب ہیں، ان کے علاوہ بہت سے تفصیلی احکام ہیں جن کو فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے۔

انسانی حقوق کا تحفظ اور فدائی حملے

گزشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں امن کے حالات ہوں یا جنگ کے، ہر حال میں انسانی حقوق کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے، اب آئندہ اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ فدائی حملے انسانی حقوق کے بیان کردہ اس ضابطۂ اخلاق کے مطابق درست ہیں یا نہیں؟ یہاں فدائی حملوں کی شرعی حیثیت اور جواز وعدم جواز کی بحث عمومی اعتبار سے نہیں ہوگی، بلکہ بحث کا موضوع یہ ہوگا کہ فدائی حملے انسانی حقوق کے بیان کردہ ضابطے کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ گویا کہ انسانی حقوق کے تحفظ و عدم تحفظ کی روشنی میں فدائی حملوں کی حیثیت کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کے پس منظر میں فدائی حملوں کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ان کا حکم بھی مختلف ہے۔ پہلے ہم ان مختلف صورتوں کو ذکر کرتے ہیں۔

فدائی حملے کی ناجائز صورتیں

فدائی حملے کی درج ذیل صورتیں متفقہ طور پر ناجائز ہیں:

پہلی صورت: فدائی حملہ آور ایسے مقامات اور عمارتوں کو نشانہ بنائے جہاں جنگ سے لاتعلق بوڑھے، عورتیں اور بچے ہی رہتے ہوں اور وہ مقام فوج اور اس کی عسکری قوت سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو، جیسے ہسپتال، اسکول وغیرہ۔

دوسری صورت: فدائی حملہ آور کفار کے اُن مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں کو نشانہ بنائے جہاں دنیا سے لاتعلق پادری قیام پذیر ہوں، جیسے چرچ اور کلیسا وغیرہ۔

تیسری صورت: فدائی ایسے غیر مسلموں کو حملہ کا نشانہ بنائے جو اسلامی ملک کے شہری بن چکے ہوں۔

چوتھی صورت: فدائی حملہ آور کا شکار غیر اسلامی ملک کے وہ شہری ہوں، جو

اسلامی حکومت سے قانونی اجازت حاصل کر کے وہاں عارضی طور پر قیام پذیر ہوں، اور ان کا مقصدِ قیام خلافِ اسلام سازش کرنا نہ ہو، اور نہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔

پانچویں صورت: فدائی حملہ آور اسلامی ملک کی ہی املاک وتعمیرات اور وہاں کے باشندوں کو نشانہ بنائے، تاکہ اس کے ذریعہ سے حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنے سیاسی یا مذہبی مقاصد حاصل کرے اور دیگر غیر جمہوری اور مفادِ عامہ کے خلاف پالیسیوں اور اقدامات سے باز رہنے پر اسے مجبور کرے۔

یہ تمام صورتیں (قطع نظر اس کے کہ فدائی حملے بذات خود جائز ہیں یا نہیں) چونکہ اسلامی جنگی ضابطۂ اخلاق کے منافی ہیں، اس لیے وہ انسانی حقوق کے بیان کردہ اسلامی اصول واحکام کے خلاف ہیں، جن کی اسلام میں اجازت نہیں۔

ابتدائی دوصورتوں کے عدم جواز کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

ارشادِ خداوندی ہے:

وَقَاتِلُواْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُونَکُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبِّ الْمُعْتَدِیْنَ (البقرۃ: ۱۹۰)	اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور چونکہ مذکورہ بالا لوگ ''یقاتلونکم''میں شامل نہیں ہیں، اس لئے ان کا قتل کرنا 'اعتداء' میں داخل ہے۔

سورۂ نحل آیت ۹۱ گزر چکی ہے۔ اس سے ایفائے عہد کا تاکیدی حکم اور نقض عہد کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، اور ذمی، مستأمن اور معاھد کو قتل کرنا نقض عہد میں داخل ہے۔

اس پر وعید حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی حدیث رسول میں موجود ہے، جو اوپر گزر چکی ہے:..... [۲۰]

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے ایک روایت ذکر کی ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ جب کوئی لشکر روانہ کرتے تھے تو فرماتے ہیں:

انطلقوا بسم اللّٰہ و لا تقتلوا شیخاً فانیاً ولاطفلاً صغیراً و لا امرأة..الخ. ۲۱

اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔ (جنگ میں) کسی بوڑھے کھوسٹ، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔

مشہور حنفی عالم علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں کہ:

والاصل فیہ ان کل من کان من اھل القتال یحل قتلہ، سواء قاتل او لم یقاتل، و کل من لم یکن من اھل القتال لا یحل قتلہ الا اذا قاتل حقیقة، او معنیً بالرای و الطاعة والتحریض واشباہ ذلک ۲۲

اس میں اصل یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اہل قتال میں سے ہو، اسے قتل کرنا جائز ہے چاہے وہ جنگ کر رہا ہو یا نہ کر رہا ہو اور جو اہل قتل میں سے نہ ہو اسے قتل کرنا جائز نہیں، الّا یہ کہ وہ حقیقتاً جنگ کر رہا ہو یا معناً، مثلاً رائے دے رہا ہو یا جنگ پر ابھار رہا ہو، وغیرہ۔

تیسری اور چوتھی صورت کے عدم جواز پر سورۂ النحل کی آیت ۹۱ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی حدیث رسول دلالت کرتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ مسلمان حکومت نے جس شخص سے معاہدہ کر لیا ہے (خواہ وہ معاہدہ بین الممالک امن کا ہو یا کسی فردِ واحد کو امان دینے کا، بہر دو صورت) اس شخص کو قتل کرنا خواہ کسی بھی طریقے سے ہو وہ اسلامی شریعت کی رو سے ایک ممنوع فعل ہوگا۔

مسلمانوں نے معاہدوں کی پاسداری کا کس قدر اہتمام کیا ہے اس کی کئی مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایفائے عہد کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

امام ترمذیؒ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور اہل روم کے درمیان معاہدۂ صلح تھا۔ وہ ان کے علاقے میں تھے۔ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی انھوں نے ان پر حملہ کرنا چاہا۔ اچانک دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار، چلّاتا ہوا آ رہا ہے: ''اللہ اکبر، عہد پورا کرو، غدّاری نہ کرو'' وہ حضرت عمرو بن عبسہؓ تھے۔ حضرت معاویہؓ نے دریافت کیا تو انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

من کان بینه وبین قوم عهدٌ فلا یحلّنّ عهداً ولا یشدّنه حتیٰ یمضی امده او ینبذ الیهم علیٰ سواء.

اگر کسی شخص کے درمیان اور کسی قوم کے درمیان معاہدہ ہو تو وہ ہرگز اس معاہدہ کو نہ توڑے اور نہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ یہاں تک کہ اس کی مدت گزر جائے، یا علانیہ اس معاہدے کو ختم کرے۔

یہ سن کر حضرت معاویہؓ اپنی فوج کے ساتھ واپس آ گئے۔۲۳

پانچویں صورت کے عدم جواز کے بارے میں شرعی حکم اور دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

جنادۃ بن ابی امیہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عبادۃ بن صامتؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ بیمار تھے۔ ہم نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ آپ کی صحت بحال کرے۔ ہمیں کوئی حدیث سنایئے جو آپ نے نبی ﷺ سے سنی ہو۔ انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے ہمیں بلایا اور ہم سے بیعت لی۔ آپ نے جن باتوں پر ہم سے بیعت لی ان میں سے ایک یہ بات بھی تھی:

وان لاننازع الامر اهله الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من الله فیه برهان..... ۲۴

کہ ہم اقتدار اہل اقتدار سے چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے، الّا یہ کہ صریح کفر کا ارتکاب کیا جا رہا ہو اور اس کے خلاف من جانب اللہ قطعی دلیل موجود ہو۔

امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومعنی الحدیث: لا تنازعوا ولاة الامور فی ولایتهم ولا تعترضوا علیهم الا ان تروا منهم منکراً محققاً تعلمونه من قواعد الاسلام فاذا رأیتم ذلک فانکروا علیهم

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں کا اقتدار چھیننے کی کوشش نہ کرو اور نہ ان کی مخالفت کرو، الّا یہ کہ تم ان سے کسی ایسے کام کو سرزد ہوتا ہوا دیکھو جسے اسلام کے اصولوں کے خلاف سمجھتے ہو۔ اگر ایسا دیکھو

وقولوا بالحق حیث ما کنتم، واما الخروج علیهم وقتالهم فحرام باجماع المسلمین، وان کانوا فسقة ظالمین، وقد تظاهرت الاحادیث بمعنی ما ذکرته واجمع اهل السنة ان لا ینعزل السلطان بالفسق. ۲۵

تو ان پر نکیر کرو اور حق بات کہو، خواہ جس حال میں بھی ہو۔ البتہ ان کے خلاف خروج کرنا اور ان سے جنگ کرنا حرام ہے۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے، خواہ وہ فاسق اور ظالم ہوں۔ اس بات پر بہ کثرت احادیث دلالت کرتی ہیں اور اس پر اہل سنت کا اجماع ہے کہ حکم راں کو فسق کی بنیاد پر معزول نہیں کیا جائے گا۔

حدیث بالا اور اس کی تشریح سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ مسلمان حکمراں کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں ہے، اگر چہ وہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہو، البتہ اگر اس کی طرف سے کفر صریح کا اظہار اور ضروریات دین کا واضح انکار ہو تو اس صورت میں اس شخص کے لئے جو قدرت رکھتا ہو اسکے خلاف خروج جائز ہے۔ ۲۶

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اوپر ذکر کردہ خاص صورتوں اور حالات میں فدایانہ کاروائیاں کرنا اسلام کے قانون تحفظ انسانی حقوق کے خلاف ہے اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام اپنے متبعین کو کس قدر کنٹرول کرتا ہے، کہ میدان جنگ اور دشمن کے خلاف مسلح کارروائی میں بھی کسی ایسے اقدام کی اجازت نہیں دیتا جو انسانی حقوق کے اصول وضوابط کے خلاف ہو۔

فدائی حملے کی جائز صورتیں

فدائی حملے کی جو صورتیں جائز معلوم ہوتی ہیں اور ان میں کسی کا اختلاف نہیں ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱) دشمن سے جنگ کے دوران میں فدائی حملہ آور بم یا بارود لے کر محارب قوم کے علاقے میں گھس جائے اور پھر اس بم یا بارود کو اپنے سے علیٰحدہ کر کے اپنے ٹارگٹ پر پھینک دے اور خود وہاں سے نکلنے کی پوری کوشش کرے، لیکن اپنے ہی بم یا

بارود کی زد میں آ کر شہید ہو جائے۔ بظاہر اس صورت کا جواز موجود ہے۔

۲) حملہ آور محارب قوم کی فوجی تنصیبات کو ختم کرنے کے لیے گولہ بارود کے ساتھ ان میں گھس پڑے اور اس کوشش میں مارا جائے۔

یہ دونوں صورتیں اوپر ذکر کردہ شرائط اور مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہیں:

۱) حملہ آور کو اس بات کا یقین یا غالب گمان ہو کہ اس کے اس حملہ کی وجہ سے محارب قوم کا یقینی نقصان ہوگا (خواہ قتل کی صورت میں ہو یا کثیر تعداد میں فوج کو شدید زخمی کرنے کی صورت میں ہو یا دشمن پر نفسیاتی برتری حاصل ہونے اور رعب ڈالنے کی صورت میں ہو)۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ صورتیں بھی جائز نہیں ہوں گی جیسا کہ فقہاء کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

چنانچہ ابن حجر العسقلانی، الجصاص، الشوکانی اور علامہ السرخسی نے معمولی فرق کے ساتھ یہ نص ذکر کی ہے:

وأما مسئلة حمل الواحد على العدد الكثير من العدو فصرح الجمهور بأنه ان كان لفرط شجاعته وظنه أنه يرهب العدوّ بذلك ويجرّئ المسلمين عليهم ونحو ذلك من المقاصد الصحيحة فهو حسن ومتى كان مجرّد تهوّر فممنوع ولا سيّما ان ترتب على ذلك وهن فى المسلمين. ۲۷	رہا یہ مسئلہ کہ ایک شخص دشمن کی بڑی تعداد پر حملہ آور ہو، تو جمہور نے صراحت کی ہے کہ اگر وہ ایسا اپنی غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے کرے اور اسے یہ غالب گمان ہو کہ اس طریقہ سے وہ دشمن کو خوف زدہ کر دے گا، مسلمان ان پر جری ہو جائیں گے اور دیگر فائدے حاصل ہوں گے تو ایسا کرنا صحیح ہے۔ لیکن اگر ایسا محض ناعاقبت اندیشی پر مبنی دلیری کے اظہار کے لیے ہو تو ممنوع ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب اس سے مسلمانوں میں کمزوری آ جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس جائز صورت کا تعلق اصلاً حالت جنگ سے ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ فریق مخالف کے نقصان کا غالب گمان ہو، ورنہ یہ حملہ جائز نہ ہوگا،

خصوصاً جبکہ اس حملہ کے بعد مسلمانوں کی جان، مال اور عزت وآبرو کے بڑے نقصان کا اندیشہ ہو۔

۲) حملہ آور کی نیت مخالف طاقت کو کم زور کرنے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کا کلمہ بلند کرنے کی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّه..... (الانفال:۳۹)

اور ان کافروں سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ایک آدمی مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے۔ ایک آدمی شہرت حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے۔ کس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا:

من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله. ۲۸

جو شخص اس لیے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہوگی۔

۳) فدائی حملہ آور اس حملہ کا ہدف ان کفار کو بنائے جو مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہوں، خواہ انہوں نے مسلمانوں کے علاقے پر قبضہ کیا ہو یا اپنے ہی ملک میں ہوں، لیکن مسلمانوں کے ساتھ ان کی جنگ جاری ہو اور مسلمانوں کی ان کے ساتھ صلح یا امن کا کوئی معاہدہ نہ ہو یا معاہدہ تو ہو مگر اسے انہوں نے توڑ دیا ہو۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ وہ ملک جس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے اور مسلمانوں کے علاقوں میں گھس کر ان کے خلاف لڑ رہا ہے ان کے مقابلہ میں فدائی حملوں کی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

فدائی حملے کی مختلف فیہ صورتیں

فدائی حملے کی کچھ صورتیں ایسی ہیں جن میں اہلِ علم کی آراء میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں ان صورتوں کو ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ فدائی حملہ آور اپنے جسم کے ساتھ بم یا بارود باندھے یا اسے لباس میں چھپا کر دشمن کی صفوں میں یا اس کی تنصیبات میں گھس جائے اور اس بارود کے پھٹنے کے ساتھ اس کا جسم بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے۔

۲۔ فدائی کسی بارود سے بھری گاڑی، ٹینک یا جہاز کو لے کر جائے اور اس کو دشمن کی تنصیبات، افواج، حساس علاقوں میں بغیر کسی توقف کے دے مارے، جس سے سوار سمیت وہ سواری تباہ ہو کر دشمن کا نقصان کرے۔

ان دونوں صورتوں کا حکم نصوص شرعیہ اور جزئیات فقہیہ میں تلاش وغور کرنے کے باوجود واضح نہیں ہوا، اس لیے اس قسم کے حملہ کے جواز وعدم جواز میں معاصر اہلِ علم کی دو رائے ہیں:

(الف) عدم جواز کی رائے

پہلی رائے یہ ہے کہ چونکہ اس قسم کے حملہ میں حملہ آور پہلے خود اپنے کو قتل کرتا ہے، پھر دشمن کو، اس لئے یہ صورت خودکشی کے مشابہ ہے۔ لہٰذا اس قسم کا حملہ کرنا خلاف احتیاط ہے، خواہ اس میں دشمن کو نقصان پہنچانے اور ان کو ضرر عظیم لاحق ہونے کا غالب گمان ہو۔ اس لئے یہ صورت درست نہیں ہے،

امام محمدؒ نے فرمایا ہے:

ولو أن مشركاً طعن مسلماً برمح فأنفذه فأراد أن يمشي في الرمح اليه ليضربه بالسيف فان كان يخاف الهلاك ان فعل ذلك ويرجو النجاة ان خرج من الرمح فعليه أن يخرج (لان المشي اليه في الرمح اعانة علىٰ

اگر کوئی مشرک کسی مسلمان کو نیزہ مارے جو اس کے جسم میں گھس جائے، اب وہ مسلمان چاہے کہ نیزہ اس کے جسم میں گھسا ہونے کے باوجود وہ اس مشرک تک پہنچ کر اس پر تلوار سے حملہ آور ہو تو اگر ایسا کرنے میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو اور اگر وہ نیزہ نکال دے تو اس کی جان بچ سکتی ہو تو اسے چاہیے کہ نیزہ نکال دے۔ اس لیے

قتل نفسه والواجب علیٰ کل أحد الدفع عن نفسه بجهده أوّلاً ثم النیل من عدوّه..... ۲۹

کہ نیزہ کے ساتھ دشمن تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے جب کہ ہر شخص پر لازم ہے کہ دشمن کو نقصان پہنچانے سے قبل اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کی کوشش کرے۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی جان ایک قلعہ فتح کرنے سے یا پورے جزیرۂ عرب سے یا دشمن کے چار ہزار افراد کو قتل کر کے کسی قلعہ کو فتح کرنے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے اس قسم کے حملوں سے احتیاط کرنا ہی بہتر ہے۔ جن لوگوں نے اس قسم کے حملوں میں حصول رضائے الٰہی کے لئے جان دے دی ہو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اس رائے کے قائل شیخ عبداللطیف المناوی اور جامعۂ ازہر کے مفتی شیخ طنطاوی اور سعودی عرب کے بعض اوقاف کے علماء اور دارالعلوم کراچی کے مفتی حضرات ہیں۔ ۳۰

(ب) جواز کی رائے

دوسری رائے جو اکثر معاصر علماء اور خاص طور پر عرب علماء (جیسے شیخ یوسف القرضاوی، شیخ عجیل جاسم النشمی، شیخ عکرمہ صابری مفتی القدس وغیرہ) کی ہے، وہ یہ ہے کہ اس قسم کا حملہ کرنا (ان تمام قیود و شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے جو جواز کی صورتوں میں ذکر کی گئی ہیں) جائز ہے، بلکہ عین شہادت ہے۔ ۳۱

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- سورۂ البقرۃ (۱۹۰، ۱۹۳) اور سورۂ توبہ (۳۶، ۱۱۱) کی آیات۔

۲- قصہ أصحاب الأخدود۔

۳- کسی مسلمان کو جب کفار نے ڈھال بنا لیا ہو تو اس کو قتل کرنے کے جواز پر قیاس۔

۴- کفار کے قلعوں اور شہروں میں مقیم مسلمانوں کی موجودگی کے باوجود ان پر

حملہ کرنے یا پانی چھوڑنے یا پتھر پھینکنے کے جواز پر قیاس (کہ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی جانوں کی قربانی دی جاسکتی ہے)۔

۵- وہ تمام آثار صحابہ و تابعین جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یقینی موت کے مواقع میں اپنے آپ کو ڈالا اور شہید ہوگئے۔

جواز کے قائلین کے دلائل کا جائزہ

اگر جواز کے قائلین کے دلائل پر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو ان کے مدعیٰ کو ثابت کرنے کے لئے واضح اور حتمی ہو۔ مثلاً:

۱۔ سورۃ البقرۃ و سورۃ التوبۃ کی آیت (۱۱۱) سے استدلال کرنا بہت بعید ہے، اس میں واضح طور پر آیا ہے یُقْتَلُوْنَ یعنی وہ کفار کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں، جب کہ صورت مختلف فیہ میں فدائی خود اپنے ہاتھوں اپنے کو قتل کرتا ہے۔

۲۔ قصۂ اصحاب الأخدود سے استدلال کرنا بھی درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں 'لڑکے' نے بادشاہ کو صرف اپنے قتل کا طریقہ بتلایا تھا، نا کہ خود اپنے ہاتھوں قتل ہوا تھا، اور اس کا اپنے کو قتل کروانے کی کوشش کرنا اس لیے تھا تاکہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی حقیقت واضح ہوجائے، اس کا کوئی متبادل طریقہ نہ تھا، چنانچہ اس کے نتیجے میں وہی ہوا جس کے لئے اس 'لڑکے' نے قربانی دی تھی۔

قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے:

وقول الغلام هذا وفعله ما فعل بنفسه ودل عليه الملك من قتله ليشتهر في الناس أمر الايمان ويرو ابرهانه كما كان..... ۳۲

لڑکے نے جو بات کہی اور جو کچھ کیا اور بادشاہ کو اپنے قتل کا طریقہ بتایا وہ اس لیے کیا تاکہ لوگوں میں ایمان کی بات عام ہوجائے اور وہ اس کی دلیل دیکھ لیں اور ایسا ہی ہوا۔

دوسرا جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ یہ ''شرائع من قبلنا'' میں سے ہے اور وہ اس صورت میں حجت ہوتے ہیں جب کہ اس کے خلاف کوئی دلیل ہماری شریعت میں نہ

ہو، جبکہ ابن عربیؒ نے 'احکام القرآن' میں وضاحت سے لکھا ہے کہ یہ حکم ہمارے یہاں منسوخ ہو چکا ہے، وہ فرماتے ہیں:

والذی یختص بہ من الأحکام ھھنا أن المرأۃ و الغلام صبرا علی العذاب من القتل والصلب و القاء النفس فی النا ر دون الایمان وھذا منسوخ عندنا حسبما تقرر فی سورۃ النحل. ۳۳	یہاں معلوم ہورہا ہے کہ عورت اور لڑکے نے قتل اور پھانسی کے عذاب کو گوارا کیا اور خود کو آگ میں ڈال دیا، مگر ایمان سے نہیں پھرے۔ یہ ان کے لیے مخصوص حکم تھا۔ ہماری شریعت میں یہ منسوخ ہے، جیسا کہ سورۂ النحل میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو ڈھال بنانے کی صورت اور کفار کے علاقوں میں رہائش پذیر مسلمانوں پر حملہ کرنے کی صورت پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک ناگزیر صورت ہے جس کا لحاظ کرنے سے ترکِ جہاد کرنا پڑے گا، جیسا کہ اس کی وضاحت فقہاء نے فرمائی ہے، چنانچہ علامہ سرخسیؒ نے 'المبسوط' میں وضاحت فرمائی ہے:

فیتعذر علیھم لأجل ذلک قتالھم وھذا لایجوز. ۳۴	ایسا کرنے سے تو ان سے قتال ہی ناممکن ہوجائے گا اور یہ جائز نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس صورت میں بھی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر ان کو بچانے کی کوئی صورت ہو تو ان کو بچایا جائے، حتیٰ کہ بعض حضرات (مثلاً حسن بن زیادؒ) نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اس صورت میں اگر مسلمان کو بچانے کی کوئی صورت نہ بنے تو حملہ نہ کریں، کیونکہ مسلمان کا قتل حرام ہے اور کفار کے قتل کو چھوڑ دینا جائز ہے۔.....۳۵

جس صورت میں مسلمان دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو اس کی کس قدر مشروط و ناگزیر حالات میں اجازت ہے تو جس صورت میں مسلمان خود اپنے ہاتھوں اپنے کو قتل کرے اس کی کیسے اجازت ہوسکتی ہے۔؟

تیسری بات یہ ہے کہ فقہ کا ایک عام اصول ہے:

یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام..... ۳۶

عام ضرر کو دفع کرنے کے لیے خاص ضرر کو برداشت کیا جائے گا۔

اس قاعدہ کی بنا پر ضرر عام (دشمن سے قتال نہ کرنا اور زمین پر ظلم و فساد کو باقی رکھنا) کو دفع کرنے کے لئے ضرر خاص (چند مسلمانوں کی شہادت) کو برداشت کیا جائے گا۔ اس قاعدہ کو اپنے ہاتھوں قتل ہونے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ صحابہؓ کا اپنے کو مواقع ہلاکت میں ڈالنا بھی فدائی حملوں کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ ان میں سے کچھ واقعات میں تو صحابہؓ نے حضور ﷺ کے دفاع کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا اور یہ فعل عین اجر و ثواب کا باعث تھا۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں خود کو قتل نہیں کیا۔ اور بعض واقعات میں وہ کفار کی صفوں میں گھس کر کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے اور یہ صورت فدائی حملوں کی ذکر کردہ صورت سے مختلف ہے۔

اس لیے ہماری رائے کے مطابق زیر بحث صورت میں فدائی حملے کی عام حالات میں اجازت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ عدم جواز کے دلائل بہت زیادہ واضح ہیں۔

حواشی و مراجع

۱۔ ابو یوسف امام قاضی یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۸۹، ص ۱۸۹

۲۔ زیدان، عبدالکریم الدکتور، احکام الذمیین و المستأمنین فی دار الاسلام، المطبع جامعہ بغداد، ۱۹۶۳ ص ۸۷

۳۔ ایضاً، ص ۹۱

۴۔ السیوطی امام، جلال الدین بن ابی بکر، الجامع الصغیر فی حدیث البشیر والنذیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۱ء، ج ۲، ص ۴۷۳

۵۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۴-۱۲۵

۶۔ کتاب الخراج، ص ۷۲

۷ احکام الذمیین ،ص ۹۹

۸ الجصاص، ابوبکر احمد بن علی، احکام القرآن، داراحیاء التراث العربیۃ، بیروت،۱۹۸۵ ج ۲،ص ۴۳۶، والکاسانی ،علاؤالدین ابو بکر بن مسعود بن احمد، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ، ج ۵،ص ۱۹۳

۹ الکاندھلوی، محمد یوسف، حیاۃ الصحابۃ ، کتب خانہ فیضی، لاہور،س ن، ج ۱،ص ۱۱۳

۱۰ مسلم بن الحجاج القشیر ی ،الجامع الصحیح ،قدیمی کتب خانہ، کراچی،۱۹۵۶، ج ۱،ص ۵۳

۱۱ ایضاً ج ۳،ص ۱۳۵۷، الموصلی، عبد اللہ بن محمود، الاختیار لتعلیل المختار، دارالمعرفۃ، بیروت ، لبنان، ۱۹۹۸، ج ۴،ص ۱۱۸

۱۲ لجنۃ المؤلفین، الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ ، ج ۱۲ ص ۱۴۸

۱۳ ابوالمعالی، برہان الدین محمود بن صدر الشریعۃ البخاری ،المحیط البرھانی ،مطبع: ادارۃ القرآن، کراچی ،۱۴۲۴/۲۰۰۴ء، ج ۷،ص ۹۷

۱۴ البخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح ، کتاب الجھاد، باب قتل النساء فی الحرب ، حدیث: ۳۰۱۵

۱۵ المحیط البرھانی ج ۷ص ۹۷

۱۶ الزحیلی، وھبۃ ،دکتور، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دارالفکر، دمشق، ۱۹۹۷ء، ۱۴۱۸ھ، ج ۴،ص ۵۸۵۵

۱۷ النووی امام ابوزکریا محی الدین بن شرف :المجموع شرح المھذب (کتاب السیر والجہاد) داراحیاء التراث العربی بیروت، لبنان ، ۲۰۰۱ء/۱۴۲۲ھ، ج ۱۱،ص ۱۰۷ اور ۱۰۸

۱۸ صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب اثم من قتل ذمّیاً بغیر جرم، حدیث: ۶۹۱۴

۱۹ لجنۃ المؤلفین ،الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ، ج ۷،ص ۱۵۱،

۲۰ ملاحظہ کیجیے حاشیہ نمبر ۱۸

۲۱ التھانوی ظفر احمد العثمانی ، علامہ، اعلا السنن ، دارالکتب العلمیۃ ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء، ج ۱۲،ص ۱۸

۲۲ بدائع الصنائع ،ج ۶،ص ۶۳

۲۳ الترمذی، ابوعیسیٰ، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، الجامع، ابواب السیر، باب ما جاء فی الغدر، حدیث: ۱۵۸۰

۲۴ مسلم بن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح، کتاب الإمارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ، حدیث: ۴۷۷۱

۲۵ النووی، ابوزکریا محی الدین بن شرف، شرح مسلم، قدیمی کتب خانہ کراچی ۱۹۵۶، ج ۲، ص ۱۲۵

۲۶ تفصیل کے لئے دیکھیے: عثمانی، محمد تقی، مفتی، حکیم الامت کے سیاسی افکار، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۹۹۴، ص ۶۹

۲۷ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، ج ۱۲، ص ۳۹۱، والبصاص، احکام القران، ج ۱، ص ۲۶۲ والشوکانی، فتح القدیر، ج ۱، ص ۱۹۳، السرخسی، شرح السیر الکبیر ج ۴، ص ۱۵۱۲

۲۸ صحیح بخاری، ۲۶۵۵

۲۹ السرخسی، شرح السیر الکبیر ج ۴، ص ۱۵۱۱،

۳۰ تفصیل کیلئے دیکھیے: جریدۃ الشرق الاوسط، اپریل ۲۰۰۰، شمارہ ۸۱۵۸

۳۱ دیکھیے:

www.islamonline.net\fatwa\arabic\fatwadisplayID=98657

۳۲ قاضی عیاض، اکمال المعلم بفوائد مسلم، دارالوفاء، بیروت ۱۹۹۸، ج ۸ ص ۵۵۷

۳۳ ابن العربی، احکام القرآن، ج ۴ ص ۱۹۱۶

۳۴ السرخسی، المبسوط، ج ۱۰ ص ۶۴

۳۵ ایضا

۳۶ الحموی احمد بن محمد، غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر، تحت القاعدۃ الخامسۃ

دو ضروری اعلانات

(۱) پتا کی تبدیلی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی اپنے زمانۂ قیام سے کرایہ کے ایک کوارٹر (پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ) سے اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ چند سال سے وہ اپنی ذاتی عمارت میں منتقل ہوگیا ہے۔ لیکن بعض مصالح کی بنا پر اب تک رابطہ کا پتا تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ بہ راہ کرم آئندہ سے درج ذیل پتے پر خط وکتابت کی جائے:

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر (جمال پور) پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

رسائل کے مدیران سے بھی گزارش ہے کہ وہ درج بالا پتے پر اپنے رسائل بھجوائیں۔

(۲) زرتعاون میں اضافہ

تحقیقات اسلامی کے زرتعاون میں ۲۰۰۱ء کے بعد سے اب تک کوئی اضافہ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن کاغذ، طباعت، ڈاک اور دیگر مصارف میں مسلسل اضافہ کی بنا پر اب اس میں کچھ اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے۔ اس لیے اگلے شمارے سے زرتعاون کی شرح حسب ذیل ہوگی:

☆ برائے انفرادی خریداران: فی شمارہ: ۳۰ روپے، سالانہ: ۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے: ۵۰۰ روپے

☆ برائے لائبریریز وادارے: سالانہ زرتعاون: ۱۵۰ روپے

☆ برائے پاکستان: (انفرادی): ۲۰، ڈالر امریکی، (ادارے): ۲۵ ڈالر امریکی

☆ برائے دیگر ممالک: (انفرادی): ۲۵ ڈالر امریکی، (ادارے): ۳۰ ڈالر امریکی

امید ہے مجلّہ تحقیقات اسلامی کے قارئین اس ناگزیر اضافہ کو بہ خوشی گوارا کریں گے اور حسب سابق اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔

(منیجر)

'فی ظلال القرآن' کی بعض تفسیری خصوصیات
(سورۂ یوسف کی روشنی میں)

سید حامد عبدالرحمٰن الکاف

سید قطب شہیدؒ (ش۱۹۶۶ء) کی تفسیر 'فی ظلال القرآن' نہ صرف پہلی تحریکی تفسیر ہونے کی وجہ سے عربی تفاسیر میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے، بلکہ اس کی اور بھی اہم خصوصیات ہیں جن پر اب تک، میرے علم کی حد تک، کسی نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی یا غیر عربی زبانوں میں جن حضرات نے سید قطب شہیدؒ کی سیرت پر قلم اٹھایا ہے، یا ان کی تفسیر اور دیگر کتب کے ترجموں پر مقدمے لکھے ہیں وہ تفسیر یا قرآنی علوم کے طالب علم نہیں تھے، یا انھوں نے ان کی تفسیر کا فنِ تفسیر کے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا۔ ذیل میں اسی خاص رخ سے اس اہم تفسیر کے مطالعہ کی کوشش کی جارہی ہے۔

پہلی خصوصیت: قرآن کے متن کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا

'فی ظلال القرآن' کو بہت غور وخوض سے پڑھنے والے یہ بات ضرور محسوس کریں گے کہ سید قطب نے متنِ قرآن کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا، ہر حصہ کی انفرادی خصوصیات کو ملحوظ رکھا اور اس حصہ کا اس سے پہلے اور بعد کے حصوں سے ربط واضح کیا، تاکہ ہر سورت از اول تا آخر ایک اکائی اور وحدت بن کر قارئین کے سامنے آسکے۔

مثال کے طور پر ہم سورۂ یوسف کو لیتے ہیں۔ اس سورت کو انھوں نے چھ بڑے حصوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ: پہلی آیت سے آیت نمبر ۲۰ تک

دوسرا حصہ: آیت نمبر ۲۱ سے آیت نمبر ۳۴ تک
تیسرا حصہ: آیت نمبر ۳۵ سے آیت نمبر ۵۳ تک
چوتھا حصہ: آیت نمبر ۵۴ سے آیت نمبر ۷۹ تک
پانچواں حصہ: آیت نمبر ۸۰ سے آیت نمبر ۱۰۱ تک
چھٹا حصہ: آیت نمبر ۱۰۲ سے آیت نمبر ۱۱۱ تک، جو خاتمۂ سورت ہے۔

آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ یہ حصے چھوٹے اور بڑے ہیں۔ جہاں پہلے حصہ میں ۱۰ آیتیں ہیں وہاں دوسرے حصہ میں ۱۴ آیات پائی جاتی ہیں۔ تیسرے حصہ میں ۱۷ آیات ہیں، جب کہ چوتھا حصہ ۲۶ آیتوں پر مشتمل ہے۔ یہی حال باقی حصوں کا بھی ہے، جن میں آیات کی تعداد میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

اب اس کے بعد ہر حصہ کی اندرونی تقسیم کی طرف توجہ دیجئے۔

پہلے حصہ کو انھوں نے چھ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) آیت نمبر ۱ سے آیت نمبر ۳ تک۔ (۲) آیت نمبر ۴ سے آیت نمبر ۶ تک۔ (۳) آیت نمبر ۷ سے آیت نمبر ۱۰ تک۔ (۴) آیت نمبر ۱۱ سے آیت نمبر ۱۴ تک۔ (۵) آیت نمبر ۱۵ سے آیت نمبر ۱۸ تک۔ (۶) آیت نمبر ۱۹ سے آیت نمبر ۲۰ تک۔

دوسرے حصہ کو انھوں نے کچھ اس طرح تقسیم کیا ہے:

(۱) آیت نمبر ۲۱۔ (۲) آیت نمبر ۲۲۔ (۳) آیت نمبر ۲۳ سے آیت نمبر ۲۹ تک۔ (۴) آیت نمبر ۳۰ سے آیت نمبر ۳۴ تک۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان اندرونی تقسیمات کے بعض اجزاء جہاں صرف ایک آیت پر مشتمل ہیں، وہیں ان کی تعداد بعض دوسرے حصوں میں ۴ یا ۵ تک پہونچ گئی ہے۔

دوسری خصوصیت: تفسیر کے وقت آیات کی کتابت

جب بات تفسیر تک پہونچتی ہے تو وہ آیات قرآنی کو جدید ترین طرز پر لکھتے

ہیں، یعنی وہ اس کتابت میں نقطۂ توقف کامل (۔) FULL STOP اور (،) COMA اور ابتداء کلام کے لیے (:) SEMI COLON اور ابتداء کلام اور انتہائے کلام کو ظاہر کرنے کے لیے (" ") INVERTED COMAS استعمال کرتے ہیں، تاکہ ایک پیراگراف کے اجزاء ابتدا سے انتہا تک باہم مربوط محسوس ہوں اور کلام میں تسلسل اور روانی پیدا ہوسکے۔ مثال کے طور پر انھوں نے حصۂ اول کے دوسرے جزء (آیات: ۴-۶) کو یوں لکھا ہے:

"إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ: يَا أَبَتِ، إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَباً وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ. رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ. قَالَ: يَا بُنَيَّ لاَ تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ، فَيَكِيدُواْ لَكَ كَيْداً. إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ. وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ، وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الأَحَادِيثِ، وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ، وَعَلَى آلِ يَعْقُوبَ، كَمَا أَتَمَّهَا عَلَى أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ، إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ."

اس کی تفصیل یہ ہے:

الف) سب سے پہلے تو انھوں نے (" ") INVERTED COMAS سے اس حصہ کو شروع کیا اور ختم بھی اسی پر کیا۔

ب) " " کے بعد وہ ہمیشہ دو نقطے (..) لگاتے ہیں۔ یہ ان کا ایک طے کردہ طریقہ ہے۔

ج) کسی قول کے شروع ہونے سے قبل (:) SEMI COLON استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ آیت بالا میں یا ابتِ ... سے قبل اس کا استعمال کیا ہے۔

د) انھوں نے ان تین آیتوں میں سات مرتبہ (،) COMA استعمال کیا ہے۔ یہ بات انگریزی مضمون نویسی میں معروف ہے کہ کاما (،) کسی لمبے جملے کو چھوٹے چھوٹے ذو معنیٰ ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ح) ان تین آیتوں میں انھوں نے (۔) FULL STOP کا چار بار استعمال

کیا ہے، جو کہ ایک بامعنٰی جملے کے اختتام پر استعمال ہوا کرتا ہے۔

یہ بات اب زبان و ادب کے طریقۂ تدریس میں مسلّمہ امر بن چکی ہے کہ اس قسم کا جدید طرزِ کتابت وتحریر قاری کو مطالب و معانی کے سمجھانے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔اس سے ربطِ کلام از خود واضح ہوجاتا ہے۔

سید قطب جدید ادب اور خصوصاً انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے جس میں ان اشارات کا استعمال بہت عام ہے، بلکہ ان کی باقاعدہ تعلیم انگلش گرامر اور کامپوزیشن (مضمون نویسی) میں دی جاتی ہے۔ کامپوزیشن کا ایک جزء پیراگراف کی تحریر بھی ہوتا ہے، جس کو ایک بامعنٰی وحدت کی طرح لکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔یہ پیراگراف آپس میں معنوی حیثیت سے مربوط ہوکر ایک مستقل بالذات مضمون کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

یہی بات مولانا حمید الدین فراہی (م۱۹۳۰ء) کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ وہ عربی، فارسی اور عبرانی زبانوں کے ساتھ انگریزی پر بھی عبور رکھتے تھے۔انھوں نے اپنی تفسیر میں 'ربط کلام' پر بہت زور دیا ہے، جسے وہ نظام سے تعبیر کرتے ہیں۔

تیسری خصوصیت : ربط آیات ومطالب ومعانی

اس تفسیر کی تیسری اہم خصوصیت ربطِ آیات ہے۔سید قطبؒ ہر سورت کو ابتدا سے انتہا تک اس طرح لے کر چلتے ہیں کہ وہ پہلی آیت سے آخری آیت تک ایک مربوط کلام معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ کلامِ الٰہی کسی بھی سورت کی پہلی آیت سے آخری آیت تک ، ایک دریا ہے جو اپنی منزل یا مرکزی مضمون کی طرف رواں دواں ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ سید قطب نے سورۂ یوسف کی ابتدا کو اس کی انتہا سے کتنے مسحور کن انداز میں جوڑا ہے۔

سورۂ یوسف کے بارے میں متداول مصاحف اور خاص طور پر مصحف امیری میں لکھا ہوا ہے کہ اس کی ابتدائی تین آیات اور آیت نمبر ۷ مدینہ میں نازل ہوئی تھیں اور یہ کہ آیت نمبر ۱۱۱، جو اس سورت کی آخری آیت ہے، سورۂ ھود کے بعد نازل ہوئی ہے۔

بالفاظِ دیگر اس سورت کی ایک سو گیارہ (۱۱۱) آیتوں میں سے چار آیات (۱،۲،۳،۷) مدنی اور باقی ۱۰۷ آیات مکی ہیں۔ ان میں بھی آیت نمبر ۱۱۱، جو ترتیب مصحف میں آخری آیت ہے، ترتیبِ نزولی کے لحاظ سے پہلی آیت ہے۔ لیکن سید قطب کو اس سے اختلاف ہے، انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ:

الف) اس سورت کی تمام ۱۱۱ آیتیں مکی ہیں، ان میں سے ایک آیت بھی مدینہ میں نازل نہیں ہوئی ہے۔

ب) آیت نمبر ۱۱۱ ترتیب نزول کے اعتبار سے پہلی آیت نہیں ہے، بلکہ وہ آخر ہی میں نازل ہوئی ہے۔

ذیل میں اس تعلق سے ان کے دلائل نقل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

''یہ مکی سورت ہے جو سورۂ ہود کے بعد اس پرخطر مرحلہ میں نازل ہوئی جس کے بارے میں ہم نے سورۂ یونس اور سورۂ ھود کے مقدموں میں کلام کیا ہے۔ یہ پرخطر مرحلہ عام الحزن (غم کا سال) ـــــ جو جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی موت کا سال ہے جو رسول اللہؐ کے پشت پناہ تھے ـــــ اور پہلی اور دوسری بیعت عقبہ کے درمیان واقع ہوا ہے۔ یہ بیعتیں وہ عہد و پیمان ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ اور ان کے ساتھیوں اور دعوتِ اسلامی کے لیے، مدینہ کی طرف ہجرت کی صورت میں راہ نجات بنائی۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جو اس خطرناک مرحلہ میں نازل ہوئیں جس سے دعوتِ اسلامی، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحابؓ گزر رہے تھے۔

یہ سورت از اول تا آخر مکی ہے، اس اشارہ کے برخلاف جو مصحف امیری میں کیا گیا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی تین آیات مدنی ہیں۔ اس لیے کہ یہ آیات ان کے فوراً بعد شروع ہونے والے قصۂ یوسفؑ کا فطری مقدمہ ہیں۔ ان آیات کو ہم نقل کیے دیتے ہیں:

''الٓرٰ تِلْکَ آیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ. إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِیّاً لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُونَ.

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَـٰذَا الْقُرْآنَ، وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ . . .'' (آیات:۱-۳)

''الر، یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ ہم نے اس کو عربی قرآن (کی شکل میں) نازل کیا ہے، تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔ ہم تو کو بہترین قصہ سناتے ہیں اس قرآن میں جس کی وحی ہم نے تم پر کی ہے، اگرچہ کہ تم اس سے پہلے اس سے لاعلم تھے۔''

ان آیات کے بعد وارد ہونے والی آیت یہ ہے:

''إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ: يَا أَبَتِ، إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَباً وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ، رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ . . .'' (آیت نمبر۴)

''(یاد کرو اس وقت کو) جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے ابا جان، میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو مجھے سجدہ کرتے دیکھا ہے . . .''

اس آیت کے بعد یہ سورت آگے بڑھتی ہوئی اپنے خاتمہ کی طرف رواں دواں ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی تمہید آیت نمبر۳ میں بیان ہوئی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہید اس واقعہ کے نزول کے لحاظ سے ایک فطری امر ہے۔

سورت کی ابتدا میں (الر) حروف مقطعات آئے ہیں۔ ان کے بارے میں قطعی طور پر کہا جارہا ہے کہ وہ واضح کتاب کی آیات ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو 'قرآن عربی' کی شکل میں نازل فرمایا ہے . . . یہ بات بھی مکی فضا اور ماحول سے مناسبت رکھتی ہے، جس میں مشرکین کے اس دعویٰ کا کہ کوئی عجمی (غیر عربی) شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی تعلیم دیتا ہے، مقابلہ قرآن کی عربیت (یعنی فصاحت و بلاغت) سے کیا جاتا تھا اور یہاں یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے، کیونکہ آپ اس سورت کے مضامین اور موضوعات سے لاعلم تھے۔

علاوہ ازیں یہ تمہید اس تعقیب وتبصرہ کے ساتھ گہری مناسبت رکھتی ہے جو (اس قصہ) کے آخر میں وارد ہوئی ہے: ''یہ وہ غیب کی خبریں ہیں، جن کی وحی ہم تم پر کررہے ہیں اور تم اس وقت ان کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے باتفاق (اس امر کا) فیصلہ کیا،

اس حال میں کہ وہ ایک مکر بھری چال چل رہے تھے'' (آیت نمبر۱۰۲) ۔اس سے پتا چلتا ہے کہ مقدمہ اور تمہید اور خاتمہ اور تعقیب واقعہ میں ایک گہرا ربط ہے۔

رہی ساتویں آیت تو اس کے بغیر سیاقِ کلام ہی درست نہیں ہوتا ہے اور یہ بات کچھ جچتی نہیں ہے کہ یہ سورت تو مکہ میں نازل ہوئی ہو اور یہ آیت اس سورت کے سیاق میں نہ ہو اور پھر مدینہ میں اس کے نزول کے بعد اس سورت میں شامل کر دی گئی ہو! اس کی دلیل یہ ہے کہ آٹھویں آیت میں ایک ایسی ضمیر ہے جو یوسف اور ان کے بھائیوں کی طرف لوٹتی ہے، جن کا تذکرہ ساتویں آیت میں ہے۔ اس طرح یہ بات درست نہیں ہوسکتی کہ آٹھویں آیت کے ساتھ اس سے پہلے کی آیت (یعنی ساتویں آیت) نازل نہ ہوئی ہو:

''لَّقَدْ كَانَ فِيْ يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيٰتٌ لِّلسَّائِلِيْنَ. إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَى أَبِيْنَا مِنَّا...''

''سوال کرنے والوں کے لیے یوسف اور اس کے بھائیوں میں بہت سی آیات (علامات اور دلیلیں) ہیں (آیت نمبر۷) جب انھوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ پیارے ہیں (آیت نمبر۸)''

اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ دونوں آیتیں (یعنی آیت نمبر۷ اور نمبر۸) اس سورت کے مسلسل سیاق میں بیک وقت نازل ہوئی ہیں۔

پوری سورت کے موضوع، مباحث، بیانات اور اشارات و کنایات پر مکی دور کی چھاپ واضح ہے۔

(فی ظلال القرآن، دار الشروق بیروت، ۱۴۰۲ھ-۱۹۸۳ء، جلد چہارم، ص ۱۹۴۹-۱۹۵۰)

پھر سید قطبؒ آیت نمبر ۱۱۱، یعنی اس سورت کی آخری آیت کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں:

''یوسفؑ کے قصہ میں مختلف قسم کے شدائد اور آزمائشیں ہیں: کنویں میں، عزیز

مصر کے محل میں، جیل خانہ میں۔ اس کے علاوہ لوگوں سے مایوسی کی کئی جھلکیاں ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ وضاحت ہے کہ بالآخر متقین کا انجام بہتر ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اس کے علاوہ یوسفؑ کا قصہ انبیاء کرامؑ کے قصوں کا ایک نمونہ ہے، جس میں صاحب عقل کے لیے سامانِ عبرت ہے۔ اس میں اللہ کی نازل کردہ سابقہ کتابوں کی تصدیق ہے، جب کہ ان کتابوں سے حضرت محمد ﷺ واقف نہیں تھے۔ اس سے یہ بات ناممکن ہے کہ اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ من گھڑت ہوں، کیونکہ جھوٹی اور من گھڑت باتیں ایک دوسرے کی تصدیق نہیں کرتی ہیں۔ وہ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں نہ ان میں مؤمن کا دل رحمت کی راحت اور امید کی کرن محسوس کرتا ہے:

''ان کے قصہ میں عقل مندوں کے لیے سامانِ عبرت ہے، یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے، بلکہ اس بات کی تصدیق ہے جو پہلے نازل ہوچکی ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ایمان والوں کے لیے سامانِ ہدایت اور باعثِ رحمت ہے''۔ (آیت نمبر ۱۱۱)

اس طرح اس سورت کی ابتدا اور انتہا میں یکسانیت اور توافق پیدا ہوتا ہے، جس طرح اس قصہ کی ابتدا اور انتہا میں یکسانیت اور توافق پایا جاتا ہے۔ رہے تبصرے اور تعقیبات تو وہ ابتدائے سورت اور انتہائے سورت اور ان کے درمیان قصہ کے موضوع سے ہم مزاج، ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوکر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح اس کی عبارتیں اور ان کی ادائی کا طریقہ بھی ہم مزاج ہوکر ظاہر ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس قصہ کا دینی مقصد بھی حاصل ہوجاتا ہے اور اس کی فنی خصوصیات بھی پوری طرح کھل کر آجاتی ہیں سچی روایت کے روپ میں اور واقعات اور موضوع میں یک جہتی اور ہم آہنگی کے لحاظ سے بھی۔

''یہ قصہ ایک ہی سورت میں شروع ہوا اور اختتام کو بھی پہونچا، کیونکہ اس کا مزاج اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کو اسی طرح ادا کیا جائے۔ یہ ایک خواب ہے جو آہستہ آہستہ پائے تکمیل کو پہونچتا ہے، ایک دن کے بعد دوسرے دن میں، ایک مرحلے کے بعد دوسرے مرحلے میں۔ اس کا نتیجہ اس وقت تک سرِ بام نہیں پہونچ سکتا ہے—— اور نہ اس

میں فنی ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے—جب تک سیاقِ قصہ اس کے مراحل کو ایک کے بعد دوسرا طے کرتے ہوئے اختتام تک نہ پہونچائے۔ اس کا کچھ حصہ ایک جگہ بیان کرنے سے وہ کچھ حاصل نہیں ہوسکتا (جو بیک وقت بیان کرنے سے حاصل ہوا ہے) جیسا کہ دیگر انبیاء کرامؑ کے قصوں کو بعض ٹکڑوں میں بیان کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بطور مثال سلیمانؑ کے قصہ کا ایک ٹکڑا بلقیس کے ساتھ، مریمؑ کی پیدائش کا ٹکڑا، عیسیٰؑ کی پیدائش کا قصہ ٹکڑے کی حیثیت سے، نوحؑ اور طوفان نوحؑ کا ٹکڑا۔ یہ ٹکڑے اپنی اپنی جگہوں اور سیاق و سباق میں اپنے اپنے مقاصد کو مکمل طور پر پورا کرتے ہیں۔ لیکن قصۂ یوسف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کو پورے کا پورا مسلسل اور مربوط حصوں میں اور مناظر کی شکل میں از اول تا آخر بیان کیا جائے (تاکہ وہ اپنے مقاصد کو پورا کرسکے) اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

''ہم تم کو بہترین قصہ سناتے ہیں اس قرآن کا جس کی وحی ہم تم پر کر رہے ہیں، اگرچہ کہ تم اس سے پہلے اس سے لاعلم تھے''۔

(فی ظلال القرآن، جلد چہارم، ص ۲۰۳۷)

اس طرح سید قطبؒ نے سیاقِ کلام کو قوی ترین دلیل قرار دیتے ہوئے ان چاروں آیات کا مکی ہونا ثابت کیا ہے جن کو عام طور پر مدنی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن پر مسلسل غور وفکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ان میں اتنی بصیرت پیدا کردی تھی کہ وہ بعض قرآنی موضوعات پر اپنی انفرادی نظر رکھتے تھے۔

یہاں بھی سید قطبؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے افکار میں ہم آہنگی اور توارد محسوس ہوتا ہے۔ مولانا فراہی جس چیز کو نظام اور عمود سے تعبیر کرتے ہیں سید قطبؒ اسی کو تناسق اور سیاق کا نام دیتے ہیں۔ تناسقِ کلام اور سیاق کلام اور ان سے پیدا ہونے والی سورت کی اپنی شخصیت اور شکل وصورت سے جو چیزیں میل نہیں کھاتیں یا ان کے ہم مزاج نہیں ہوتیں سید قطب ان کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے سورۂ یوسف کی مذکورہ بالا چار آیتوں کے بارے میں اپنا مدلّل اور مستحکم موقف پیش کیا۔ انھوں نے زور دے کر یہ بات کہی کہ زیر بحث چاروں آیتیں بھی ایک ہی وقت مکہ میں

نازل ہوئیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کلام اپنی وحدت کھو بیٹھتا اور اس سورت کی شخصیت مسخ ہوکر رہ جاتی اور اس کا سارا حسنِ بیان اور وضاحت ختم ہوجاتی ۔

مولانا فراہیؒ نے بھی سورۂ یوسف کا عمود بیان کرتے ہوئے ایسی ہی بات لکھی ہے۔ اپنی اہم تصنیف دلائل النظام میں فرماتے ہیں:

سورۂ یوسف: اشارة الی قرب الهجرة وتمثیل الفرج بعد الیأس وغلبة الحق (ک) (ص۵۹)	سورۂ یوسف: قرب ہجرت کی طرف اشارہ اور مایوسی اور تنگی کے بعد فراخی اور کشادگی اور حق کی کامیابی اور فتح یابی کی تمثیل ہے۔ (یہ مکی سورت ہے)۔

یہی عمود سید قطبؒ نے اپنی تمہید، دوران تفسیر اور خاتمۂ تفسیر میں بڑے شاندار انداز میں بیان کیا ہے۔

چوتھی خصوصیت: تاریخی پس منظر میں سورتوں پر غور وخوض

'فی ظلال القرآن' ایک تحریکی تفسیر ہے، اس لیے اس کے مصنفؒ کے لیے یہ امر ناگزیر تھا کہ وہ ہر سورت کو اس کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر اس کے مضمرات، متضمّنات، اسباب و نتائج، دلائل و براہین، ابتدا اور انتہا، لب ولہجہ کے زیر و بم، طریقۂ استدلال اور کلام کے رخ جیسے سارے ہی پہلوؤں پر تدبر کرے اور پھر اس بحر ناپیدا کنار کے ان انمول اور نایاب موتیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جن کا حصول صرف خوش قسمت اور نیک بخت لوگوں کی تقدیر ہوا کرتا ہے۔

اس کی مثال خود سورۂ یوسف ہے۔ اس سورت کی تمہید کا آغاز انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''یہ ایک مکی سورت ہے جو سورۂ ہود کے بعد اس پرخطر دور میں نازل ہوئی جس کی طرف ہم نے سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مقدمات میں اشارات کیے ہیں۔ یہ مرحلہ رسول اللہ ﷺ کے دو پشت پناہ- جناب ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ- کی موت (یعنی عام

الحزن) اور بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانی کے درمیان واقع ہے جس کے ذریعہ (یعنی ہجرت کے ذریعہ) اللہ نے رسول اللہ ﷺ، اہل ایمان اور دعوتِ اسلامی کے لیے تنگی اور شدت کے بعد فراخی اور کشادگی کی راہ نکالی۔

(فی ظلال القرآن، جلد چہارم، ص ۱۹۴۹)

اس افتتاحیہ میں انھوں نے نہ صرف سورۂ یوسف کے نزول کا زمانہ اور اس کی کیفیات بیان کر دیں، بلکہ اس میں اور سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں تاریخی پس منظر کے نقطۂ نظر سے جو بات قدرِ مشترک ہے وہ بھی بیان کر دی، یعنی تاریخی واقعات کی روشنی میں رسول، رسالت اور وحی سے انکار کرنے والوں کی تباہی کی کھلی کھلی دھمکی اور حضرت محمد ﷺ اور آپ کی دعوت کے بارے میں انتہائی مایوس کن حالات میں گھر جانے کے بعد فتح و نصرت کی بشارت۔ اس طرح یہ ان تینوں سورتوں کا مشترکہ عمود یا مرکزی مضمون قرار پاتا ہے۔

اس پرخطر دور اور اس میں نازل ہونے والی سورت (سورۂ ہود) نے جو نفسیاتی کیفیت رسول اللہ ﷺ کے ذہن و دماغ میں پیدا کی اس کا اندازہ آپ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا، اس لیے کہ اس میں رسالت اور وحی کے منکرین کا عبرت ناک انجام، تاریخی مناظر کی شکل میں، ایک کے بعد ایک، بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے فطری طور پر رحمۃ للعالمین کو بھی اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو صاف صاف بچا کر منکرین کو ختم نہ کر دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ یوسف کے نزول نے ہجرت کی شکل میں کشادگی کے قریب آنے کی بشارت دی اور آپ کو سکونِ خاطر حاصل ہوا۔ خصوصاً سیدنا یوسفؑ کے اس قول سے: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (آج تم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے، یعنی تم کو معافی دی جاتی ہے) آپ بہت مطمئن ہوئے، واللہ اعلم، کیونکہ آپؐ نے فتح مکہ کے بعد کعبۂ مشرفہ کو بتوں سے پاک کر کے، جو تقریر فرمائی تھی اس کو غور سے پڑھنے اور سمجھنے سے یہ بات ذہن میں آ جاتی ہے:

آپ نے فرمایا: (اے اہلِ قریش) تمھارا کیا خیال ہے، آج میں تمھارے

ساتھ کیا برتاؤ کروں گا؟ اہل قریش نے جواب دیا: (آپ) ایک عالی ظرف بھائی اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔اس پرآپ نے فرمایا:**لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْم، اذهبوا فانتم طلقاء** (آج تم سے کوئی باز پرس نہیں ہے، جاؤتم آزاد ہو)۔

وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے خطا کار بھائی تھے اور یہاں حضرت محمد ﷺ کے خطا کار بھائی۔ دونوں نے اپنے اپنے گناہوں اور زیادتیوں کا اعتراف کیا اور دونوں پیغمبروں نے انہیں وہی جواب دیا جو ان کے شایانِ شان تھا۔ یعنی انبیاء کرامؑ کا باعث رحمت، کریم، فراخ دل اور عالی ظرف ہونا اور کامیابی پر انتقام نہ لینا، بلکہ معافی دے کر دل و دماغ جیت لینا۔

شاید دل و دماغ کی یہی فتح اور اس سے پیدا ہونے والی شرمندگی تھی کہ اہل مکہ فتنۂ ارتداد کے وقت اس دین پر جمے رہے، کیونکہ وہ اس محسن اعظمؐ کے احسان کے بوجھ تلے دبے جارہے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سورتوں کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر غور وفکر کرنے کے فوائد اظہر من الشمس ہیں۔ اس سے اس ماحول اور اس میں کارفرما انسانی اور غیر انسانی عوامل اور ان کے ایک دوسرے سے تعاون کرنے یا ٹکرا جانے سے جو فضا تیار ہوتی اور جو ماحول پیدا ہوتا ہے اس کی چھاپ سورت پر بڑی گہری ہوا کرتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جب کسی سورت کو بحیثیت مجموعی ایک وحدت کے طور پر یا اس کی آیات کریمہ کو فرداً فرداً یا ایک مجموعہ کی شکل میں اس ماحول اور اس فضا میں فِٹ کیا جاتا ہے تو وہ پیچیدگیاں خود بخود تحلیل ہوجاتی ہیں جو ان حضرات کو پریشانیوں کا شکار بناتی ہیں جو قرآنِ کریم اور اس کی آیات کریمہ کو ایک بے جان اور جامد چیز تصور کرکے غور کرتے ہیں، جب کہ وہ ایک جاندار، محرّک اور متحرک کلام ہے، جس نے نازل ہوتے ہی افراد، جماعات، ماحول اور فضا، اخلاق و عادات، اور طریقۂ تفکیر اور اخذ و ترک اور اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی تعلقات اور عقائد اور اقدار میں منفی یا مثبت تفاعل (تعاون یا تصادم) کی فضا پیدا کرکے ہلچل پیدا کردی تھی اور بتدریج حالات کا رخ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی طرف موڑ دیا

تھا جس میں وہ اپنا خاص نظام قائم کرنا اور چلانا چاہتا تھا۔

یہی وہ نکتہ ہے جس سے ہم سیرتِ نبویؐ اور قرآن کریم میں ربط وضبط کی اہمیت اور قرآن فہمی میں اس کے رول کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ قرآن کریم اور سیرت نبویؐ میں، جو ۲۳ سالہ مدت پر پھیلی ہوئی ہے، چولی دامن کا تعلق ہے اور جن کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرنا ناممکن ہے۔

سید قطب کے اس واضح تصور کی ایک اور مثال سورۂ فتح کے مقدمہ میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہ مدنی سورت ہے جو ہجرت کے چھٹے سال، صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی۔ یہ اس عظیم حادثہ اور اس کے واقعات پر بحث کرتی ہے اور اس کی ابتدا میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اور ان کے اطراف جو حالات تھے ان کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس کے زمانۂ نزول اور سورۂ محمد کے وقتِ نزول میں کوئی تین سال کا فرق ہے اور سورۂ محمد مصحف کی ترتیب میں سورۂ فتح سے پہلے پائی جاتی ہے۔ ان دونوں سورتوں کے نزول کے درمیانی فاصلہ میں، مدینہ میں، مسلمانوں کے حالات میں، اہم اور پرخطر تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ ان سے اہم تبدیلیاں خود ان کی اپنی نفسیاتی حالت میں پیدا ہوئیں اور ان کی ایمانی صفات میں نمودار ہوئیں اور منہج ایمانی پر عمیق فہم اور ادراک کے ساتھ جمنے میں ظاہر ہوئیں۔ (فی ظلال القرآن، جلد ششم، ص ۳۳۰۶)

اس طرح سید قطب نے سورہ فتح اور سورۂ محمد میں زمانی ربط ان باریک اشارات کے ذریعہ پیدا کیا اور دونوں کے تاریخی پس منظر کو ذہن نشیں رکھنے کی تلقین کی جو ان دونوں سورتوں کے نزول کے وقت قائم تھے۔ پھر ان دو سورتوں کے لب ولہجہ اور فضا اور کلام کے رخ میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان کو ملحوظ خاطر رکھنے کا مطالبہ کیا۔ ان سب عوامل کے نتیجہ میں وہ حقیقت سے قریب تر تفسیر وجود پذیر ہوئی جس کی تفسیر کے ذخیرے میں انفرادیت نمایاں ہے۔

ہماری چند اہم ایجنسیاں

۱- مکتبۂ اسلامی، بتّے میاں کی درگاہ، نظام الدین چوک، شاہ گنج، اورنگ آباد مہاراشٹر، موبائل: 9370282198

۲- دفتر جماعت اسلامی جموں وکشمیر، باراں پتھر، بٹہ مالو، سری نگر، (J&K)

۳- فاران بک ایجنسی، ۳۳۶ محمد علی روڈ، مالیگاؤں-۴۳۲۲۰۳، (مہاراشٹر) فون: 2698452 (246)

۴-اسلامک بک سینٹر، اسٹیشن بازار، گلبرگہ-۵۸۵۷۰۲

۵-اسلامک بک سینٹر اینڈ نیوز پیپر ایجنسی، رتکال پورہ مسجد، بیدر-۵۸۵۴۰۱، موبائل: 8482695485

۶-اسلامک بک سینٹر محلّہ پگمل، ہزاری باغ-۸۲۵۳۰۱

۷-مولانا محمد طاہر مدنی، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ (یوپی)-۲۷۶۱۲۱، موبائل: 9450737539

۸- جناب بشیر احمد راہی صاحب، ناز پریس، ملت نگر، اولڈ جالنہ-۴۳۱۲۱۳

۹- جناب شمیم حیدر صاحب، ہیڈ ماسٹر، بی، ایچ-ایس نیا مدرسہ، رائچور-۵۸۴۱۰۱

۱۰- جناب عبدالودود عالم، تاتار پور، بھاگلپور-۸۱۲۰۰۲

۱۱-عبدالغفار عبدالشکور، ۲۴۹۷-گھاس گلی، شاہ جی روڈ، احمد نگر-۴۱۴۰۰۱، فون: 2321936 (241)

۱۲- جناب محمد عبدالسلام بستوی صاحب، الفلاح کتاب سینٹر، گھیر حسن خان، نزد پکا پل، رام پور-۲۴۴۹۰۱

۱۳-محمد شکیل انور، سی ڈی ۲/۴۴۷، نزد چیک پوسٹ، پوسٹ آفس: ڈھروا، رانچی-۸۳۴۰۰۴

۱۴-صدیقی بک ایجنسی، اے بی سی، ریلوے گیٹ، شاہ آباد-۵۸۵۲۲۹، موبائل: 9986382740

۱۵-فائزہ نیوز ایجنسی، اکرام کاٹیج، گلشن کالونی، نزد ایم اے عباس، شیو پور مہیند رو، پٹنہ-۸۰۰۰۰۶، موبائل: 9835421193

۱۶-سراج الدین، پیلی حویلی چوک کامپٹے-۴۴۱۰۰۲ (مہاراشٹر)

۱۷-محمد یوسف، ۳۳- پیل خانہ، 3rd لین ہاوڑا-۱ (مغربی بنگال)

۱۸-مکتبہ اسلامی، تھانہ روڈ ۱۸۴-بھیونڈی، تھانے-۴۲۱۳۰۲ (مہاراشٹر)

۱۹-مسلم بک ایجنسی، انجمن بازار، بالاپور، ضلع اکولا-۴۴۴۳۰۲

۲۰-احمد عبدالعظیم، مکان نمبر: ۸۰-۱۵-۹، احمد پورہ کالونی، نزد مسجد عرفات، نظام آباد-۵۰۳۰۰۱

سیر وسوانح

علامہ خطابیؒ کے علمی آثار

ڈاکٹر حاتم صالح الضامن

مترجم: مولانا سراج احمد برکت اللہ فلاحی

نام ونسب

علامہ خطابی کا پورا نام اور نسب اس طرح ہے: ابوسلیمان حمد بن محمد بن ابراہیم ابن خطاب البُستی الخطابی الشافعی۔ آپ زید بن خطاب بن نفیل العدوی کی اولاد میں سے ہیں۔ بعض مصادر میں آپ کا نام 'حمد' کے بجائے 'احمد' ملتا ہے، جو غلط ہے۔

مختصر حالات

علامہ خطابی کی ولادت کابل (جو اس وقت افغانستان کی راجدھانی ہے) سے قریب ایک شہر 'بست' میں ۳۱۹ھ میں ہوئی۔

انھوں نے عالمِ اسلام کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے علم حاصل کیا۔ عراق کے شہر بغداد اور بصرہ، حجاز کے شہر مکہ اور خراسان کے شہر ماوراء النہر گئے۔ کئی سال نیساپور میں قیام کیا اور طالبانِ علم کے درمیان حدیث کا درس دیا۔ وہیں رہ کر اپنی کئی کتابیں تصنیف کیں۔

تجارت آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں تصوف کی طرف میلان ہو گیا تھا۔ چنانچہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔

آپ کی وفات 'بُست' میں صحیح قول کے مطابق ۳۸۸ھ میں ہوئی۔[۱]

اساتذہ

علامہ خطابی کے بعض مشہور اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں:

۱- احمد بن سلیمان الحنبلی، ابوبکر، ابن النجار البغدادی (م ۳۴۸ھ)

۲- احمد بن محمد بن زیاد، ابن الأعرابی (م۳۴۰ھ)
۳- اسماعیل بن محمد، ابوعلی الصفار (م۳۴۱ھ)
۴- جعفر بن محمد، المعروف بالخلدی (م۳۴۸ھ)
۵- حسن بن حسین، ابوعلی بن أبی ہریرۃ (م۳۴۵ھ)
۶- محمد بن عبدالواحد، ابوعمر الزاھد، غلام ثعلب (م۳۴۵ھ)
۷- محمد بن علی بن اسماعیل القفّال الشاشی (م۳۶۵ھ)
۸- محمد بن یعقوب، ابوالعباس الأصم (م۳۴۶ھ)

تلامذہ

علامہ خطابی کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

۱- احمد بن محمد، ابوحامد، الأسفرایینی (م۴۰۶ھ)
۲- احمد بن محمد، ابوعبید الھروی (م۴۰۱ھ)
۳- عبد بن احمد بن محمد بن عبداللہ، ابوذر الھروی (م۴۳۴ھ)
۴- حسین بن محمد الکرابیسی، ابومسعود
۵- محمد بن أحمد، ابونصر البلخی
۶- علی بن حسین السجزی
۷- جعفر بن محمد المروزی

علمی خدمات

علامہ خطابی متعدد قابل قدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ البتہ آپ کی تصنیفات میں سے صرف چند کتابیں ہی ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ وہ اچھے صاحبِ قلم اور ماہرِ فن عالم تھے۔ اس لیے ان کی کتابیں متعدد علوم وفنون پر مشتمل ہیں۔ وہ حدیث، فقہ، اصول فقہ اور لغت کے امام تھے۔ خاص طور سے لغت میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ علم بیان کے اساتذہ میں آپ کا شمار تھا۔

علامہ خطابی کی صرف چند ہی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوسکی ہیں۔ ان کی دیگر کتابوں کے یا تو کچھ مباحث بعض مطبوعہ کتابوں میں منقول ہیں، یا اُن کا صرف نام دیگر مصادر میں ملتا ہے۔

مطبوعات

علامہ خطابی کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سات ہے۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

(۱) بیان اعجاز القرآن

اس کتاب میں علامہ خطابی نے قرآن کے وجوہِ اعجاز سے بحث کی ہے اور اُن کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ بعض حضرات ایک وجہِ اعجاز 'صرفہ' کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآن جیسا کلام پیش کرنے پر انسان فطری طور پر قادر تو ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے اُن کی ہمتیں پست کردی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جو پیشین گوئیاں ہیں وہ قرآن کا اصل اعجاز ہیں اور بعض دیگر لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز بلاغت کے پہلو سے ہے۔ اکثر اہل علم و نظر کی یہی رائے ہے۔

علامہ خطابی نے لکھا ہے: ''قرآن مجید اس پہلو سے معجزہ ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کے فصیح الفاظ، بہت ہی حسین پیرائے میں اور بہترین نظم و ترتیب کے ساتھ آئے ہیں اور ان کا استعمال ان کے صحیح ترین معانی میں ہوا ہے۔ قرآن کی بلاغت کا کمال یہ ہے کہ ہر لفظ کا استعمال اس کی صحیح جگہ پر ہوا ہے''۔

یہ کتاب تین بار شائع ہوچکی ہے۔ پہلی بار عبداللہ صدیق نے قاہرہ سے ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں شائع کیا، دوسری اشاعت ڈاکٹر عبدالعلیم کی کوششوں سے ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ سے ہوئی۔ اور تیسری بار اسے اعجازِ قرآن پر باقلّانی اور رمّانی کے رسائل کے ساتھ 'ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن' کے نام سے محمد خلف اللہ اور محمد زغلول سلام نے قاہرہ سے ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔

(۲) اُعلام الحدیث فی شرح صحیح البخاری

یہ کتاب صحیح بخاری میں موجود مشکل الفاظ و اسماء کی شرح ہے۔علامہ خطابی نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے: ''اختصار کے پیشِ نظر ہم نے غریب الفاظ کی صرف اُسی قدر تشریح پر اکتفا کیا ہے جو علما اور محدثین کے لئے ضروری تھی۔اس میں بہت زیادہ تدقیق و تحقیق، ماہرینِ لغت کی آراء کے بیان، اشتقاق کی تفصیل اور لغوی نظائر کے ذریعہ استشہاد وغیرہ سے گریز کیا ہے۔تاکہ کتاب ضخیم نہ ہونے پائے''۔

مزید فرماتے ہیں: ''جب میں نے بخاری کی احادیث میں موجود مشکل الفاظ کی تشریح کی ضرورت پر غور کیا تو خیال ہوا کہ اِن میں سے بعض مباحث مکمل تشریح و تفصیل کے ساتھ میری دوسری کتاب 'معالم السنن' میں آ چکے ہیں۔ اب اگر میں اُن مباحث کو اِس کتاب میں نہ دُہراؤں تو اِس کتاب کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ ممکن ہے کسی شخص کے پاس یہ کتاب تو ہو، مگر وہ کتاب نہ ہو۔اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ایک کتاب کو پڑھنا چاہے، لیکن دوسری کتاب کے مطالعہ کی اسے خواہش نہ ہو اور اگر اُن تمام مباحث کا جس کا اُس کتاب میں ذکر ہو چکا ہے یہاں اعادہ کروں تو تکرار محض ہوگا، جو عیب ہے اور اس کی وجہ سے قاری اکتاہٹ محسوس کرے گا۔اس لیے میں نے زیادہ مناسب یہ سمجھا کہ اُس کتاب کے ضروری اور مفید مباحث کو بہت ہی ایجاز و اختصار کے ساتھ اس کتاب میں بھی ذکر کر دیا جائے۔ساتھ ہی کچھ باتوں کا اضافہ کر دیا جائے۔البتہ جو احادیث 'معالم السنن' میں مذکور نہیں ہیں اُن کی اس کتاب میں مکمل تشریح و توضیح کی جائے گی''۔

علامہ خطابی نے اپنی شرح میں فقہی آراء کا ذکر فقہاء کے ناموں کی صراحت کے ساتھ کیا ہے اور سببِ اختلاف بھی بیان کیا ہے۔

اِس کتاب میں کل ۴۰۷ احادیث اور ۱۵۴ آثار کی شرح ہے۔علامہ خطابی نے اپنی شرح میں ۴۵۱ قرآنی آیات، ۱۲۷ اشعار، ۹ مصرعوں اور ۷۸ عربی محاوروں سے

استشہاد کیا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد بن سعد بن عبدالرحمٰن کی تحقیق کے ساتھ مکۃ المکرّمۃ سے ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۳) معالم السنن فی تفسیر کتاب السنن

یہ کتاب امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی (م۲۷۵ھ) کی مشہور کتاب 'السنن' کی شرح ہے۔ سنن ابی داؤد کا مقام ومرتبہ بیان کرتے ہوئے علامہ خطابی نے مقدمہ میں لکھا ہے: ''بلاشبہ سنن ابی داؤد بہت اہم کتاب ہے۔ علوم دینیہ (حدیث) میں ایسی کوئی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ ہر جگہ کے لوگوں کے درمیان اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔ علما، محدثین اور فقہاء کے مختلف گروہوں میں اس کتاب کو اہم مقام حاصل ہے۔ سب اِس سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں۔ عراق، مصر، بلاد مغرب اور دیگر بہت سے علاقوں اور شہروں کے علما اسی کتاب کو مرجع تسلیم کرتے ہیں''۔ وہ سنن ابوداؤد کے بارے میں ابن الأعرابی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں: ''کہ اگر کسی شخص کے پاس صرف کتاب اللہ اور یہ کتاب یعنی سنن ابوداؤد ہو تو اسے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں''۔

علامہ خطابی کے بعد جن علماء نے کتب احادیث کی شرحیں لکھی ہیں، انھوں نے 'معالم السنن' کو اپنا مرجع بنایا ہے اور اس کے بکثرت حوالے دیے ہیں۔ ان میں حافظ ابن حجر، علامہ عینی، علامہ قسطلانی اور دیگر علماء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

یہ کتاب دوبار زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ محمد راغب الطباخ کی تصحیح کے ساتھ ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۲ء میں حلب (شام) سے اور دوسری بار احمد محمد شاکر اور محمد حامد الفقی کی تحقیق کے ساتھ ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء میں قاہرہ (مصر) سے شائع ہو چکی ہے۔

(۴) غریب الحدیث

یہ بہت عمدہ اور قابل قدر تصنیف ہے۔ اس کے شروع میں علامہ خطابی نے ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں ابتدائی تین صدیوں کے علماء اور محدثین کا مقام و

مرتبہ اوران کی فضیلت بیان کی ہے۔ پھر بتایا ہے کہ ''جب یہ دور ختم ہوگیا اور غیر عرب علماء احادیث نقل کرنے لگے، رواۃ کی کثرت ہوگئی اور تلفظ ولغت کی غلطیاں ہونے لگیں، اس وقت علمِ حدیث میں بصیرت ومہارت رکھنے والے علما اور محدثین نے احادیث میں موجود غریب الفاظ کو جمع کیا، مشکل الفاظ کی تشریح وتوضیح کی اور اُن کا صحیح مفہوم بیان کیا۔ ناقلین حدیث نے جو غلطیاں کی تھیں ان کی اصلاح کی اور اس فن پر مستقل کتابیں ترتیب دیں، اس طرح ان کی توضیحات وتشریحات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئیں''۔ آگے انھوں نے بیان کیا ہے کہ ''اس فن میں سب سے پہلی کتاب علامہ ابوعبید قاسم بن سلام کی 'غریب الحدیث' ہے۔ دوسری کتاب علامہ ابن قتیبہ کی ہے جو اِسی نام سے اور اِسی منہج پر لکھی گئی ہے۔

ان کتابوں میں تمام احادیث کا احاطہ نہیں ہوسکا ہے، اس لیے علامہ خطابی نے اپنی کتاب لکھی۔ انھوں نے بھی وہی منہج اپنایا جو ان کے پیش رووں کا ہے۔ انھوں نے وہ احادیث جن کے غریب الفاظ کی تشریح وتوضیح ان دونوں کتابوں میں کی جاچکی تھی ان کا اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا ہے۔ الّا یہ کہ ضمناً یا بطور استشہاد ان کا تذکرہ آجائے۔ البتہ اگر علمائے متقدمین کے یہاں ایسی کوئی تشریح ملتی ہے جو ابوعبید یا ابن قتیبہ کی تشریح سے مختلف ہوتی ہے تو اس کا ذکر کرتے ہیں۔

بعد کے ادوار میں جن علما اور محدثین نے غریب الحدیث پر کتابیں لکھی ہیں، انھوں نے اِس کتاب کا، حوالہ کے ساتھ یا بلا حوالہ، بہت استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱- ابوعبید الھروی (م ۴۰۱ھ) مؤلف 'الغریبین'۔
۲- البیہقی (م ۴۵۸ھ) مؤلف 'السنن الکبریٰ'۔
۳- زمخشری (م ۵۳۸ھ) مؤلف 'الفائق'۔
۴- ابوموسی المدینی (م ۵۸۱ھ) مؤلف 'المجموع المغیث'۔
۵- جوزی (م ۵۹۷ھ) مؤلف 'غریب الحدیث'۔

۶- ابن الاثیر (م۶۰۶ھ) مؤلف 'منال الطالب فی شرح طوال الغرائب' اور 'النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر'۔

۷- ابن قدامہ المقدسی (م۶۲۰ھ) مؤلف 'قمعۃ الأریب فی تفسیر الغریب'۔

۸- ابن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ) مؤلف 'فتح الباری'۔

۹- العینی (م۸۵۵ھ) مؤلف 'عمدۃ القاری'۔

علامہ خطابی کی یہ کتاب 'غریب الحدیث' عبدالکریم العزباوی کی تحقیق کے ساتھ دمشق سے ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔

(۵) اصلاح غلط المحدثین

اس کتاب کا موضوع بعض اُن الفاظ کی تصحیح ہے جن کے تلفظ میں رواۃ حدیث سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس میں ۱۴۳۔ ایسی احادیث زیر بحث آئی ہیں جن کے بعض الفاظ صحیح شکل میں ضبط تحریر میں لانے یا ان کے معنٰی سمجھنے میں رواۃ سے غلطی ہوئی ہے۔ علامہ خطابی نے ان غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے اور ان کے صحیح تلفظ اور درست معانی بھی بتائے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں اپنا منہج بیان کرتے ہوئے علامہ خطابی نے لکھا ہے:

''احادیث میں مذکور یہ چند الفاظ جو اکثر رواۃ اور محدثین کی غلطی یا تحریف کی وجہ سے کچھ سے کچھ نقل ہو گئے تھے ہم نے ان کی اصلاح کر دی ہے اور احادیث کے صحیح اور ثابت شدہ الفاظ کو بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض احادیث میں ایسے الفاظ ہیں جن میں کئی معانی کا احتمال تھا۔ ہم نے ان میں سے سب سے زیادہ واضح معنٰی و مفہوم کو اختیار کیا ہے''۔

اس کتاب میں بہت سے اہم لغوی مباحث مذکور ہیں۔ مؤلف نے الفاظ کے بارے میں صراحت کی ہے کہ وہ مہموز ہیں یا مقصور یا ممدود، انھوں نے اِن الفاظ کا اشتقاق بھی بیان کیا ہے جن مین راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے دس مقامات پر قرآنی آیات اور بائیس مقامات پر عربی اشعار و اقوال سے

استشہاد کیا ہے۔

علامہ خطابیؒ کی یہ کتاب دراصل ان کی ایک دوسری اہم کتاب 'غریب الحدیث' کا ایک حصہ ہے۔ اسے انھوں نے اس کتاب سے الگ کرکے اور اس میں کچھ اضافہ کرکے مستقل کتاب بنادی ہے۔ ان کے سوانح نگاروں مثلاً یاقوت حموی، ابن خلکان اور صفدی وغیرہ نے دونوں کا الگ الگ کتابوں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں احادیث کے درج ذیل الفاظ کی تصحیح کی گئی ہے:

۱- احادیث کے وہ الفاظ جن میں اکثر رواۃ سے تصحیف ہوئی ہے۔

۲- وہ الفاظ جن کو ازالۂ اِشکال کے لیے مہموز (ہمزہ کے ساتھ) پڑھنا چاہیے تھا، لیکن عام رواۃ نے ایسا نہ کیا۔

۳- وہ الفاظ جنھیں تشدید کے ساتھ بیان کرنا چاہیے تھا، لیکن رواۃ نے بلا تشدید بیان کردیا ہے۔

۴- وہ الفاظ جنھیں بلا تشدید بیان کرنا چاہیے تھا، لیکن رواۃ نے انھیں تشدید کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

۵- وہ اسماء جو بلا تشدید تھے، لیکن رواۃ نے تشدید کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۶- وہ اسماء جن کو بلا تشدید پڑھنا چاہیے تھا، لیکن رواۃ نے الف مقصورہ کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

۷- وہ الفاظ جنھیں الف ممدودہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے تھا، لیکن رواۃ نے الف مقصورہ کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

۸- وہ الفاظ جنھیں الف ممدودہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے تھا، لیکن رواۃ نے انھیں الف مقصورہ کے ساتھ بیان کردیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے معانی یکسر بدل گئے ہیں۔

۹- وہ الفاظ جنھیں الف مقصورہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے تھا، لیکن رواۃ نے الف ممدودہ کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

۱۰- وہ الفاظ جو مختلف روایات میں بدلتے رہے، لیکن اُن کے معانی نہیں بدلے۔

یہ کتاب سب سے پہلے ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ پھر راقم سطور (ڈاکٹر حاتم الضامن) نے اس پر نظر ثانی اور تحقیق کی اور ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء میں 'مجلۃ المجمع العلمی' میں اس کی اشاعت ہوئی۔ پھر دو سال بعد ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی۔ ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء میں یہ دمشق سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

(۶) شأن الدعاء

اس موضوع پر بہت سے علما، مفسرین، محدثین اور ماہرین لغت وادب نے لکھا ہے، لیکن علامہ خطابیؒ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اور بے نظیر کتاب ہے۔

یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں دعا کا معنٰی ومفہوم اور دین میں اس کی اہمیت اور مقام بیان کیا ہے۔ یہ بحث کی ہے کہ دعا سے مصیبت ٹل جاتی ہے اور قضا و قدر کے فیصلے بھی بدل سکتے ہیں۔ اس مسئلہ میں علماء کی دو رائیں ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جو کچھ قضا وقدر کا فیصلہ ہو چکا ہے، دعا سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ دعا سے پریشانی دور ہوتی ہے اور مستقبل میں کوئی مصیبت آنے والی ہو تو وہ بھی ٹل جاتی ہے۔ علامہ خطابی نے دونوں گروہوں کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے مؤخر الذکر گروہ کی تائید کی ہے۔

کتاب کے اس حصے سے قضا وقدر اور دعا کے سلسلے میں پیدا ہونے والے بہت سے سوالات کا جواب مل جاتا ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے معبود سے دعا اور امید کا تعلق باقی رکھے۔

دوسرے حصے میں اللہ کے ان اسماء حسنٰی کی تشریح کی گئی ہے جو حدیث میں مذکور ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللّٰہ تسعة و تسعین اسماً مأئة الا واحداً من حفظها دخل الجنة و هو وتر یحب الوتر۔[۲]	اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو انھیں یاد کرلے جنت میں جائے گا۔ اللہ ایک ہے اور وہ اسی کو پسند کرتا ہے۔

علامہ خطابیؒ نے اِن اسمائے حسنٰی کی لغوی تحقیق کے ساتھ ان کے فقہی مدلول کی بھی وضاحت کی ہے۔

تیسرے حصے میں انھوں نے وہ ماثور دعائیں درج کی ہیں جنھیں امام ابن خزیمہؒ نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا تھا۔ علامہ خطابیؒ نے اِس رسالہ کو بعینہٖ نقل کر دیا ہے اور آخر میں 'من لو احق الدعاء' کا عنوان قائم کر کے پینتیس (۳۵) ماثور دعاؤں کا اضافہ کر دیا ہے۔

اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ امام ابن خزیمہؒ کی ایک کتاب محفوظ شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے ۱۳۶ قرآنی آیات، ۱۴۸ احادیث، ۱۱ اقوال و امثال اور ۶۶ اشعار سے استشہاد کیا ہے۔

یہ کتاب احمد یوسف دقّاق کی تحقیق کے ساتھ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں دمشق سے شائع ہوئی ہے۔

(۷) العزلۃ (گوشہ نشینی)

اس کتاب کا دوسرا نام 'الاعتصام بالعُزلۃ' بھی ہے۔ اس میں امام خطابیؒ نے بیان کیا ہے کہ عزلۃ (گوشہ نشینی) سے ان کی مراد کیا ہے؟ ایک باب میں اس موضوع پر آیات، احادیث اور آثار جمع کیے ہیں، فتنوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان صحابہ و تابعین کا ذکر کیا ہے، جو ان سے الگ تھلگ رہے۔ اس موضوع پر بہت سے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

علامہ خطابی گوشہ نشینی کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن آیات اور احادیث میں گوشہ نشینی کی مذمت کی گئی ہے اور جماعت کو چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے ان کا اطلاق اس صورت پر نہیں ہوتا جن کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے۔ دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''علیحدگی دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) افکار و عقائد کا الگ الگ ہونا۔ (۲) افراد و اشخاص کا الگ الگ ہونا۔ اسی طرح اجتماعیت دو طرح کی ہوتی ہے (۱) علماء اور امراء کی اجتماعیت (۲) عوام الناس کی

اجتماعیت۔ افکار وعقائد کا الگ الگ ہونا عقلاً ممنوع اور شرعاً حرام ہے، کیونکہ اس سے گم راہی وتعطل اور بے عملی آتی ہے۔ اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو سب کی رائے الگ الگ ہوجائے۔ یہی وہ افتراق وانتشار ہے جس کی مذمت قرآن مجید میں آئی ہے۔ یہی حکم علما اور امراء کی اجتماعیت کو چھوڑنے کا ہے کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ رہا عوام الناس سے علیٰحدگی کا معاملہ تو اس کی مذمت نہیں کی گئی ہے، بلکہ وہ ضرورت اور مصلحت کے تابع ہے۔ اگر ضرورت متقاضی ہو تو ایسا کرنا جائز ہوگا''۔ وہ مزید کہتے ہیں ''جس گوشہ نشینی کے ہم قائل ہیں اس کا مقصود یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی مجلسوں اور جمعہ کی نمازوں سے علیٰحدگی اختیار کرلی جائے، حقوق العباد سے بے توجہی برتی جائے، لوگوں کے سلام کا جواب نہ دیا جائے اور ان کے جو حقوق وفرائض عائد ہوتے ہیں انھیں نہ ادا کیا جائے۔ گوشہ نشینی سے ہماری مراد یہ ہے کہ فضول صحبت نہ ہو، غیر ضروری مجلسوں سے احتراز کیا جائے اور بلاضرورت لوگوں سے ملنا جلنا نہ ہو''۔

یہ کتاب قاہرہ سے دوبار شائع ہوئی ہے۔ پہلی بار ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء میں، دوسری بار ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء میں۔ اس کا تیسرا ایڈیشن یاسین محمد السوّاس کی تحقیق کے ساتھ دمشق سے ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا ہے۔

دیگر تصانیف

علامہ خطابی کی وہ کتابیں جن کے بعض اقتباسات دوسری کتابوں میں منقول ہیں، درج ذیل ہیں:

۱- تفسیر اللغۃ التی فی مختصر المزنی۔

اس میں فقہ شافعی پر لکھی گئی مشہور کتاب 'مختصر المزنی' کی لغات کی تشریح ہے۔ اس کا ایک اقتباس علامہ سبکی نے اپنی کتاب 'طبقات الشافعیۃ الکبریٰ' میں دیا ہے۔[۳]

۲- شعار الدین فی اصول الدین۔

اس کے اقتباسات علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب 'تلبیس الجہمیۃ' میں دیے ہیں۔[۴]

۳- الغنیۃ عن الکلام وأھلہ۔

اس کے اقتباسات بھی علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب تلبیس الجھمیۃ میں دیے ہیں۔۵

علامہ خطابی کی کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جو دستیاب نہیں اور غالباً حوادث زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ اب اُن کا ذکر صرف کتبِ تراجم میں ملتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

۱-الجھاد ۲-دلائل النبوۃ ۳-السراج ۴-الشجاج ۵-العروس ۶-علم الحدیث۔

خطابی علماء کی نظر میں

علامہ خطابی کے بارے میں علما نے بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سطور ذیل میں چند اقوال نقل کیے جارہے ہیں، جن سے ان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔

ثعالبیؒ کہتے ہیں: ''علم وادب، تقوی و پرہیزگاری اور تدریس و تالیف میں ان کا ہمارے زمانہ میں وہی مقام ہے جو علامہ ابوعبید قاسم بن سلام کا ان کے زمانے میں تھا۔ البتہ خطابی اشعار بھی کہتے تھے اور ابوعبید نے کبھی شعر گوئی نہیں کی''۔۶

سمعانی فرماتے ہیں: ''وہ امام، فاضل، جلیل القدر، بڑے شان ومرتبہ اور وقیع تصانیف والے تھے''۔۷

ابوطاہر سلفی نے لکھا ہے: ''سنن ابی داؤد کے شارح ابوسلیمان (خطابی) کی تصانیف، ان کے تحقیقی نکات اور علمی کاوشوں کا جب کسی مصنف کو علم ہوتا ہے تو وہ تسلیم کرلیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے امام تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں پوری امانت و دیانت کا ثبوت دیا ہے۔ حدیث اور دیگر علوم کے حصول کے لیے انھوں نے بکثرت سفر کیے، پھر مختلف علوم وفنون پر مشتمل کتابیں تحریر کیں''۔۸

ابن جوزی فرماتے ہیں: ''وہ تیز فہم، بے پناہ علم، لغت و معانی کی معرفت اور فقہی بصیرت رکھنے والے تھے، ان کے اشعار بھی بہت عمدہ ہیں''۔۹

یاقوت حموی کا قول ہے: ''وہ محدث، فقیہ، ادیب، شاعر اور ماہر لغت تھے''۔۱۰

علامہ سبکی کہتے ہیں: ''وہ فقہ، حدیث اور لغت کے امام تھے''۔۱۱

امام ابن کثیر کا قول ہے: ''ان کا شمار مشہور ائمہ او رکثیر الاجتہاد فقہاء میں ہوتا ہے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد بہت ہے اور ان کی متعدد قابل قدر تصانیف ہیں۔ وہ تیز فہم، بڑے صاحب علم، لغت و معانی کی معرفت اور فقہی بصیرت رکھتے تھے''۔۱۲

علامہ فیرز آبادی کہتے ہیں: ''وہ محدث، ماہر لغت، ادیب اور عظیم محقق تھے۔ ان کا شمار مشہور ائمہ میں ہوتا ہے''۔۱۳

علامہ ذہبی نے لکھا ہے: ''وہ امام، علامہ، محدث، تحصیل علم کے لیے بکثرت سفر کرنے والے اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں''۔۱۴

ابن عماد کہتے ہیں: ''وہ اپنے زمانے میں علم کے جامع، حافظ اور فقیہ تھے۔ اپنے ہم عصر علما میں نمایاں مقام رکھتے تھے''۔۱۵

شاعری

علامہ خطابی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے اشعار سے ان کا خلوص، زہد، جذبۂ ایثار اور لوگوں سے حُسنِ سلوک اور ان کے لیے خیر خواہی جھلکتی ہے۔ ان میں زندگی اور اس کے مسائل اور انسانوں سے تعلقات و معاملات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ان کے اشعار سے بخوبی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز کیا تھا؟ ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ خاموش طبیعت کے مالک تھے، شور و شغب اور ہنگاموں سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ کائنات اور زندگی کے بارے میں ہمہ وقت تفکر کرتے رہتے تھے۔

ان کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ ان میں حسین تعبیرات اور خوب صورت منظر کشی پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب پر زہد اور تقشّف کا رنگ غالب ہے۔

اختصار کے پیشِ نظر یہاں ان کے صرف دو اشعار نقل کیے جارہے ہیں۔۱۶

۱- مادمت حياً فدار الناس كلهم فانما انت فی دار المداراة

من يدر داری و من لم يدر سوف يری عما قليلٍ نديما للندامات ۱۷

جب تک تمھاری زندگی باقی رہے، تمام لوگوں سے حسنِ سلوک کرتے رہو، کیونکہ یہ دنیا جس میں تم رہ رہے ہو حُسن سلوک کرنے کی جگہ ہے۔ جو شخص اِس حقیقت کو پالیتا ہے وہ ایسا ہی کرتا ہے اور جسے اس کا شعور نہیں ہوتا اور وہ حُسنِ سلوک نہیں کرتا تو وہ عن قریب بہت شرمندگی اٹھائے گا۔

۲- شر السباع العوادی دونه وزر والناس شرهم مادونه وزر

کم معشر سلموا لم یوذهم سبع ومانری بشراً لم یوذہٖ بشرٌ [۱۸]

خوف ناک درندوں کے خطرے سے بچا جاسکتا ہے، لیکن برے لوگوں کے شر سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جو درندوں کے شر سے محفوظ رہے، لیکن ہم نے ایسا کسی کو نہیں پایا جو کسی دوسرے انسان کے شر سے محفوظ رہا ہو۔ [۱۸]

حواشی ومراجع

[۱] علامہ خطابی کی حیات اور علمی خدمات کے لیے درج ذیل مصادر ملاحظہ کیجیے: یتیمۃ الدہر: ۴/۳۳۴، طبقات فقہاء الشافعیۃ: ۹۴، الأنساب: ۵/ ۱۵۸، فہرستہ ابن خیر: ۲۰۱، المنتظم: ۶/ ۲۶۸، معجم الأدباء: ۴/ ۲۴۶ اور ۱۰/ ۲۶۸، اللباب فی تہذیب الأنساب: ۱/۴۵۲، إنباہ الرواۃ: ۱/ ۱۲۵، وفیات الأعیان: ۲/۲۱۴، تذکرۃ الحفاظ: ۹/۱۰، سیر أعلام النبلاء: ۱۷/۲۳، العبر فی خبر من غبر: ۳/ ۳۹، برنامج الوادی اشی: ۲۱۶، الوافی بالوفیات: ۷/ ۳۱۷، مرآۃ الجنان: ۲/ ۴۳۵، طبقات الشافعیۃ للسبکی: ۳/۲۸۲، طبقات الشافعیۃ لأسنوی: ۱/ ۴۶۷، البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/ ۲۳۶، الوفیات لابن قنفذ: ۲۲۲، البلغۃ فی تاریخ ائمۃ اللغۃ: ۷۳، طبقات الشافعیۃ لابن قاضی شہبۃ: ۱/۱۴۰، طبقات النحاۃ واللغویین: ۱۹۱، ۵۸۵، النجوم الزاہرۃ: ۴/ ۱۱۹، بغیۃ الوعاۃ: ۱/۵۴۶، طبقاۃ الحفاظ: ۴۰۳، مفتاح السعادۃ: ۲/۱۴۶، کشف الظنون: ۱/ ۱۰۸، شذرات الذہب: ۳/ ۱۲۷، خزانۃ الأدب: ۱/۲۸۲، الأعلام: ۲/۳۰۴، تاریخ الأدب العربی لبروکلمان: ۳/۲۱۲، تاریخ التراث العربی: ۱/۴۲۷، معجم المؤلفین: ۴/۷۴۔

۲ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعا والتوبۃ والاستغفار، باب فی أسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاہا۔
۳ ملاحظہ کیجیے: طبقات الشافعیۃ الکبری، تاج الدین السبکی، طبع مصر ۱۹۶۴-۱۹۷۶ء، ۳/۲۹۰
۴ بیان تلبیس الجہمیۃ، ابن تیمیہ، تصحیح محمد بن عبدالرحمٰن بن قاسم، مکہ مکرمۃ ۱۳۹۱ھ، ۱/۲۴۹ تا ۲۵۰۔
۵ ایضاً، ۱/۲۵۱-۲۵۲۔
۶ یتیمۃ الدھر، ثعالبی، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۹۵۶ء، ۴/۳۳۴۔
۷ الأنساب، ابوسعد عبدالکریم بن محمد بن منصور التمیمی السمعانی (م ۵۶۲ھ/ ۱۱۶۶ء) تحقیق: شیخ عبدالرحمان بن یحییٰ الیمانی، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۶ء، ۵/۱۵۹۔
۸ مقدمۃ الحافظ الکبیر ابی طاہر السلفی، م ۵۷۶ھ، معالم السنن: خطابی، تحقیق احمد محمد شاکر ومحمد حامد الفقی، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ۴/۳۷۵۔
۹ المنتظم: ۶/۲۶۸۔
۱۰ معجم الأدباء: یاقوت الحموی، مطبعۃ دار المأمون مصر، ۱۹۳۶ء، ۴/۲۴۶۔
۱۱ طبقات الشافعیۃ الکبری، سبکی، ۳/۲۸۲۔
۱۲ البدایۃ والنہایۃ، ابوالفداء حافظ ابن کثیر، (م ۷۷۴ھ)، دارالریان للتراث قاہرہ، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، ۱۱/۳۴۶۔
۱۳ البلغۃ فی تاریخ الأئمۃ: ۷۳۔
۱۴ تذکرۃ الحفاظ، ۳/۱۰۱۸۔
۱۵ شذرات الذھب، ابن عماد الحنبلی، مکتبۃ القدسی، قاہرہ، ۱۳۵۰ھ، ۳/۱۲۸۔
۱۶ خطابی کے مزید اشعار کے لیے دیکھیے: یتیمۃ الدھر: ۴/۳۳۵، معجم الادباء: ۴/۲۵۸، وفیات الأعیان: ۲/۲۱۶، الآداب: ۱۰۴، طبقات الشافعیۃ الکبری: ۳/۲۸۴۔
۱۷ معجم الأدباء، ۴/۲۵۸۔
۱۸ ایضاً

(آفاق الثقافۃ والتراث، دبئ، جلد ۹، شمارہ ۳۳، محرم ۱۴۲۲ھ/ اپریل ۲۰۰۱ء)

تعارف وتبصرہ

تعلیماتِ قرآن — اشہد رفیق ندوی

ناشر: اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، علی گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۰۴، قیمت -/۱۶۰ روپے

اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشن فاؤنڈیشن شکاگو نے اپنے ایکزیکیٹیو ڈائرکٹر ڈاکٹر عابداللہ غازی کی سربراہی میں جدید انداز میں عالمی معیار کے مطابق نصابیات سازی کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ یہ نصابی سیریز اصلاً دیارمغرب میں پرورش پانے والی نوخیز مسلمان نسل کی صحیح اسلامی تعلیمات کے مطابق ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت کے لیے تیار کی گئی ہے۔ متعدد ملکوں میں اس کی پذیرائی ہوئی ہے اور بہت سے اداروں نے اسے اپنے یہاں داخل نصاب کیا ہے۔ فاؤنڈیشن نے حکومت سنگاپور کی درخواست پر وہاں کے دینی مدارس کی جدید کاری کا کام اپنے ذمہ لیا اور پرائمری سے عالمیت کی سطح تک نصابی خاکہ، نصاب تعلیم، نصابی کتابیں، ان کے مطابق مشقی کتابیں اور رہنمائے معلّمین تیار کرائیں۔ زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک زرّیں کڑی ہے۔

یہ کتاب ثانوی درجات کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا مقصد نوجوان نسل کو قرآن مجید کی تعلیمات سے روشناس کرانا ہے۔ نصابی ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر اس میں صرف وہ تعلیمات بیان کی گئی ہیں جن کی عام طلبہ اور نوجوانوں کو زندگی کے مختلف میدانوں میں قدم قدم پر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب تین مباحث پر مشتمل ہے: عقائد، عبادات اور اخلاقیات۔ عقائد میں توحید (اللہ اور اس کے فرشتوں پر ایمان) رسالت (پیغمبروں اور آسمانی کتابوں پر ایمان) اور آخرت (قیامت، حشر، جنت وجہنم) کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ عبادات میں نماز، روزہ، حج، زکوۃ کے علاوہ جہاد فی سبیل اللہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اخلاقیات کے ضمن میں حقوق العباد، اخلاق حسنہ اور بری عادات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک باب تزکیۂ نفس اور دعوت الی اللہ پر بھی ہے۔

فاضل مصنف دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ

کے بھی فیض یافتہ ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے ایم اے (عربی) اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم فل کیا ہے اور گزشتہ ۱۷ سال سے سینئر سیکنڈری اسکول مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں عربی کے استاد ہیں۔ اقرا فاؤنڈیشن کے تحت وہ انسائیکلوپیڈیا آف قرآن اور انسائیکلو پیڈیا آف عقائد اینڈ فقہ بھی مرتب کر چکے ہیں، جو ابھی منتظرِ اشاعت ہیں۔

زیرنظر کتاب میں قرآنی تعلیمات بڑے سلیقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ عام فہم اسلوب میں بیان کی گئی ہیں اور قرآنی آیات کے ذریعے ان کو مدلّل کیا گیا ہے۔ آیات نقل کرنے میں مصحف کا طرز کتابت اختیار کیا جاتا اور اعراب لگانے کا اہتمام کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ قرآنی تعلیمات کی توضیح وتشریح میں احادیثِ نبوی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور جابجا ان کے حوالے دیے گئے ہیں، اگرچہ بہت سے مقامات پر احادیث بلاحوالہ درج ہیں۔ بعض احادیث کو عام اقوال کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً **یدالله علی الجماعة** (ص ۲۱۵) جب کہ یہ حدیث رسول ہے اور ترمذی (۲۱۶۷) اور نسائی (۴۰۲۵) میں اس کی تخریج کی گئی ہے۔ بعض احادیث کے سلسلے میں ضبط الفاظ میں کوتاہی نظر آتی ہے۔ مثلاً ص ۲۳ پر یہ حدیث درج کی گئی ہے: **تعاهدوا القرآن فوالذی نفسی بیده لهو اشدّ تعاهداً من الابل فی عقلها** اور بخاری کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جب کہ بخاری (۵۰۳۳) میں **تعاهداً** کے بجائے **تفصّیاً** کا لفظ ہے۔ یہ حدیث مسلم میں بھی ہے۔ اس میں ایک روایت (۱۸۴۲) میں **تفصّیاً** اور دوسری روایت (۱۸۴۴) میں **تفلّتاً** کا لفظ ہے۔ آخر میں کتابیات ہے، مگر وہ بڑی ناقص ہے، اس لیے کہ بہت سی کتابوں کے حوالے اندرون کتاب آئے ہیں، مگر کتابیات میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

کتاب کے بعض مشتملات پر نظرثانی اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ اخلاص کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ''حدیث میں اسے نصف قرآن کہا گیا ہے'' اور حوالہ ترمذی، ابواب فضال القرآن، باب ماجاء فی سورة الاخلاص کا دیا گیا ہے (ص ۵۳)، جب کہ ترمذی کے مذکورہ مقام پر جتنی روایتیں ہیں سب میں سورۂ

اخلاص کو 'ثلث قرآن' کہا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ مشرکین فرشتوں کو کبھی خدا کی بیٹی اور کبھی بیٹا قرار دیتے تھے (ص۲۷) جب کہ مشرکین کے، فرشتوں کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی بات محتاج ثبوت ہے۔ قیامت کے مراحل بیان کرتے ہوئے پہلا مرحلہ نفخِ صور قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں لکھا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے حکم سے دوبار صور پھونکا جائے گا'' (ص۱۲۵) جب کہ قرآنی بیانات سے تین بار صور پھونکے جانے کا اشارہ ملتا ہے۔ (تفسیر القرآن العظیم، علامہ ابن کثیر، تفسیر سورہ النمل، آیت ۸۷، تفہیم القرآن، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سورۂ حاقہ، حاشیہ ۱۰)۔ رمی جمرات کے تعلق سے لکھا گیا ہے کہ ''حاجی حضرات دو الگ مقررہ دنوں میں یہاں آ کر ان ستونوں پر کنکری مارتے ہیں (ص ۱۸۸) جب کہ رمی جمار کا عمل حجاج تین دن انجام دیتے ہیں۔

ان معمولی فروگزاشتوں کے باوجود یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت مفید اور لائق قدر ہے۔ امید ہے، طلبہ اور نوجوانوں کے درمیان اسے مقبولیت حاصل ہوگی اور عام مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

قرآنِ کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ مولانا اُسید الحق محمد عاصم قادری
ناشر: تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں، ۲۰۰۸ء، صفحات: ۶۴، قیمت: درج نہیں۔

قرآن کریم کی سائنسی تفسیر کا رجحان عربی میں غالباً شیخ محمد عبدہٗ اور اردو میں سرسید احمدؒ سے شروع ہوتا ہے۔ اس رجحان کا پیدا ہونا بعید از عقل بھی نہیں ہے، کیونکہ قرآن ایک ہمہ گیر اور عالم گیر کتاب ہے۔ اس کو جس علمی سطح کا شخص بھی پڑھے گا اس سے مطمئن ہوگا اور اسی سطح سے اس کتاب میں معنٰی آفرینی کرے گا۔ لیکن اس راہ میں افراط وتفریط کے قوی امکانات ہیں، جس کا شکار تقریباً سبھی سائنسی مفسرین نظر آتے ہیں۔ مرعوبیت، غلط تفہیم اور غیر درست تطبیق کے ساتھ عمدہ، چشم کشا اور حیرت انگیز نمونے بھی ملتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مفسرینِ قرآن کو دو طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے: اوّل قدامت پسند، دوم جدّت پسند۔ پھر جدّت پسندوں کے چار طبقات کیے گئے ہیں:

(۱)مرعوب (۲) قرآن میں خاصا درک رکھنے والے، مگر عصری علوم میں زیادہ گہری نظر نہیں (۳) عصری علوم میں زیادہ گہری نظر رکھنے والے (۴) جن کو نہ علوم قرآن میں کوئی خاص درک ہے نہ عصری علوم سے کوئی واسطہ۔ مؤلف نے اپنے تمہیدی کلمات میں اس تقسیم کے بعد ایک عنوان 'سائنسی تفسیر کا مفہوم' قائم کیا ہے۔ اس کے تحت انھوں نے اپنے ازھری استاذ ڈاکٹر جمال مصطفیٰ النجّار کے الفاظ میں سائنسی تفسیر کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

''قرآن کی وہ آیات جو انفس وآفاق کے بارے میں وارد ہیں ان کا بیان اور جدید سائنسی ایجادات اور تحقیقات کے ذریعہ ان کی شرح''۔ اس کے بعد سائنسی تفسیر کے حق میں امام غزالیؒ، امام فخرالدین رازیؒ اور امام جلال الدین سیوطیؒ کی وہ دلیلیں ذکر کی ہیں جو سائنسی مفسرین اکثر پیش کرتے ہیں۔

ایک عنوان 'متاخرین و معاصرین کی آرا' کے تحت سائنسی تفسیر کے موجودہ حامیوں کو دو طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک متشدّد ین ، دوسرے اعتدال پسند۔ متشدّ دین اس طریقۂ تفسیر کو فرضِ عین قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی شرط قبول نہیں کرتے اور مخالفین کو قدامت پرست، کوتاہ نظر، جاہل اور احمق کہتے ہیں۔ اعتدال پسند اس طریقِ تفسیر کے حامی ضرور ہیں، مگر وہ کچھ شرائط اور حدود مقرر کرتے ہیں۔ مصنف نے غالی اور متشدّ د طبقے میں سے علاّ مہ شیخ طنطاوی جوہری، علامہ عبدالرحمٰن کواکبی، علاّ مہ طاہر بن عاشور، ڈاکٹر حنفی احمد اور ڈاکٹر جمعہ علی عبدالقادر اور اعتدال پسندوں میں سے صرف شیخ متولی شعراوی کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

مخالفین میں امام ابو اسحاق شاطبیؒ، شیخ محمود شلتوتؒ، علامہ عبدالعظیم الزرقانیؒ، عباس محمود العقاد اور علاّ مہ محمد حسین الذھبیؒ کے دلائل کا تعارف کرانے کے بعد موافقین اور مخالفین کی آرا کا تنقیدی جائزہ پانچ نکات میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نکات کا لبّ لباب یہ ہے کہ سائنسی تفسیر مشروط طور پر جائز ہے، مگر اس کے لیے دونوں قسم کے علوم میں مہارت ضروری ہے، تاکہ افراط وتفریط سے بچا جاسکے اور مفسر مرعوبیت کا شکار نہ ہو۔ اگر قرآن

اور سائنس میں تعارض ہو تو مصنف کا عقیدہ ابن رشد کی طرح یہ ہے کہ یا تو سائنس میں کہیں غلطی ہے یا قرآن کی تفہیم میں کچھ کمزوری ہے۔ انھوں نے سائنسی تفاسیر میں تین بڑی بے اعتدالیوں کی نشان دہی کی ہے۔ (۱) سائنس کے ہر نظریے کو قرآن کے مطابق ثابت کر دکھانے کی جدّ و جہد (۲) قرآن اور سائنس کے درمیان تطبیق کی خاطر قرآن کے سیاق و سباق، شانِ نزول حتّٰی کہ عربی قواعد سے بھی صرف نظر۔ (۳) یہ تاثر دینا کہ نزولِ قرآن کے زمانے سے آج تک فلاں آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھا گیا اور اب سائنس نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ان کے نزدیک سائنسی تفسیر کا رواج چار وجوہ سے ہو رہا ہے: (۱) جدید ذہن کو اس طریقِ تفسیر سے متاثر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ (۲) یہ اعتقاد کہ قرآن میں اوّل و آخر تمام علوم جمع کر دیے گئے ہیں (۳) سائنس سے مرعوبیت اور اس کو حق و ناحق کا معیار سمجھ لینا (۴) مسلمانوں کا اپنے زوال اور مغرب کی ترقی کی وجہ سے احساس کم تری میں مبتلا ہو جانا۔

مؤلف نے سائنسی تفسیر کے جواز کے لیے چھ شرائط بیان کی ہیں: (۱) بغیر واضح اور قطعی قرینہ کے نصّ کو حقیقی معنٰی سے مجاز کی طرف پھیرنا جائز نہیں۔ (۲) موضوع سے متعلق تمام آیات قرآنی کو جمع کر کے ایک معنٰی متعین کرنا ضروری ہے۔ (۳) جب تک کوئی سائنسی تحقیق 'سائنسی حقیقت' کے درجے کو نہ پہنچ جائے، سائنسی تفسیر جائز نہیں (۴) نزولِ قرآن کے زمانے میں الفاظِ قرآن کے جو مدلولات تھے ان سے تجاوز کر کے وہ معنٰی اختیار نہ کیے جائیں جن میں آج وہ الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً لفظ 'ساعۃ' کو آج کے معنٰی کے مطابق گھڑی کے مفہوم میں نہ لیا جائے۔ (۵) صرفی قواعد اور اصولِ بلاغت سے خروج نہ کیا جائے۔ (۶) تطبیق کے وقت آیت کے سیاق و سباق اور شانِ نزول کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے سائنس اور قرآن کے درمیان تطبیق کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ عموماً سائنسی تقسیم کرنے والے ان شرائط کا لحاظ نہیں رکھ پاتے، اسی لئے مضحکہ خیز تفاسیر سامنے آ رہی ہیں۔ چنانچہ قرآنی آیت وَيُقْذَفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ (سبا:۵۳) سے ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ٹی

وی وغیرہ کی طرف اشارہ، دَآبَّۃُ الْاَرْضِ (النمل:۸۲) سے سٹیلائٹ، یا سات آسمانوں سے سات سیّارے مراد لینا، یا جدید ترین معلومات کی روشنی میں زمین کے اوپر نظام شمسی کو پہلا آسمان، ہماری کہکشاں کو دوسرا، اور اسی طرح مشہود آسمان کو مزید پانچ حصوں میں تقسیم کرنا، یہ سب مصنف کے نزدیک غلط تطبیقات ہیں۔ آخر میں ان کا کہنا ہے کہ 'تفہیم قرآن میں سائنسی علوم کو اس طرح استعمال کیا جانا چاہیے کہ یہ علوم قرآن کے خادم نظر آئیں، نہ کہ ان کو قرآن پر حاکم بنا دیا جائے'۔

فاضل مصنف نے مباحث مع دلائل مبسوط انداز میں پیش کیے ہیں۔ البتہ ایک کمی ضرور ہے، جس کا احساس خود انھیں بھی ہے۔ وہ یہ کہ مقبول سائنسی تشریحات کے نمونے کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ اگر تھوڑی اور محنت کر کے یہ نمونے بھی جمع کر دیے جاتے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ ممکن ہے کہ یہ نمونے اُن تفاسیر میں ہی مل جائیں جن سے غیر مقبول نمونے جمع کیے گئے ہیں۔ بہر حال کتاب بہت خوب اور تمام علما اور دانش ورانِ ملّت کے لیے سودمند ہے۔ (محمد ریاض کرمانی)

مولانا حمیدالدین فراہی-مفسّر ومحقق ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

ناشر: قرآنک ریسرچ سینٹر، کبیر کالونی، علی گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص:۲۵۱، قیمت -/۲۰۰ روپے

نظمِ قرآن اور کلامِ عرب سے استشہاد کے حوالے سے مولانا حمیدالدین فراہیؒ (۱۸۶۳-۱۹۳۰ء) کا اختصاصی نقطۂ نظر معروف ہے۔ موصوف نے قرآن کو ایک کل قرار دیا ہے جس کو الگ الگ اجزاء میں تقسیم کر کے فہم قرآن کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح تفسیر قرآن کے ضمن میں انھوں نے کلام عرب سے استشہاد کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ ان کے اس بنیادی فکر کو ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م ۱۹۹۷ء) نے آگے بڑھایا اور اس کی مدلّل توضیح وتشریح کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں انہی دونوں کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ مقدمہ کے علاوہ یہ کتاب چار مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ 'سورتوں کی گروپنگ اور عمود کا جائزہ (فراہی اور اصلاحی نقطۂ نظر)' کے عنوان سے

ہے ۔ دوسرے مقالے کا عنوان ہے: 'تفسیر فراہی میں کلام عرب سے استشہاد'۔ تیسرا مقالہ: 'فراہی نظریۂ تعلیم کی بنیاد: قرآن کریم' اور چوتھا مقالہ 'ذکر فراہی- ایک مطالعہ' کے عنوان سے ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے پہلا مقالہ نصف کتاب (ص۱۳-۱۳۱) اور دوسرا مقالہ چوتھائی کتاب (ص۱۳۳-۲۱۴) پر مشتمل ہے۔ بقیہ دو مقالے تقریباً بیس بیس صفحات کے ہیں۔ گویا یہ کتاب اصلاً پہلے دو موضوعات سے بحث کرتی ہے۔ ضمناً آخر کے دو مقالات شامل کر دیے گئے ہیں جو افادیت سے خالی نہیں۔

قرآن مجید کی ایک قسم کی گروپنگ زمانۂ نزول قرآن سے قائم ہے اور وہ ہے سورتوں کی مکی و مدنی تقسیم۔ مضامین و موضوعات کے اعتبار سے مفسرین نے ان سورتوں کی الگ الگ خصوصیات ضرور بیان کی ہیں، مگر نظم قرآن کے حوالے سے زیر تبصرہ کتاب میں مذکور گروپنگ علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی کی امتیازی خصوصیت ہے، جس سے فہم قرآن کی راہیں آسان ہوتی ہیں اور قرآن میں سورتوں اور آیتوں کے باہمی ربط کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس پہلو سے یقیناً یہ ایک عمدہ کوشش ہے، مگر اس سلسلے میں کوئی متفقہ اور طے شدہ اصول بیان کرنا شاید مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروپنگ میں استاذ و شاگرد کے درمیان کلّی اتفاق نہیں پایا جاتا اور دونوں بعض سورتوں کی تقسیم میں مختلف الرائے ہیں۔ جہاں تک تفسیرِ قرآن میں کلامِ عرب سے استشہاد کا معاملہ ہے تو بلاشبہ قرآن کے فہم میں جس ذریعے سے بھی مدد ملتی ہو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے، مگر اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کا نزول جس ذاتِ گرامی پر ہوا اس کا فہم اور تشریح بھی پیش نظر رہے، یعنی قرآن کی تفسیر بالماثور نظر انداز نہ ہو۔ اگر کلامِ عرب سے استشہاد پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے گا اور اس پر تفسیرِ قرآن کی بنیاد رکھی جائے گی تو یہ آسانی سے مشکل کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہوگا، کیوں کہ قرآن کو آسان بنایا گیا ہے۔ اس کے برعکس فنّی اعتبار سے کلام عرب کا فہم مشکل ہے اور ہر شخص کی ذہنی سطح اس کی متحمل نہیں ہوسکتی، جب کہ فہم قرآن کا ہر شخص مکلّف ہے۔ دوسری بات یہ کہ استناد وثبوت کے اعتبار سے بھی بہر حال تفسیر بالماثور کو ترجیح حاصل ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس

میں اعتدال وتوازن برقرار رہے۔اسی طرح نصاب تعلیم میں قرآن کو بنیاد بنانے سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا ،مگراس میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے۔قرآن کو بنیاد بنانے کے یہ معنیٰ نہ ہوں کہ شریعت کے دوسرے ماخذ نظرانداز ہوجائیں۔

مجموعی اعتبار سے زیرتبصرہ کتاب فکرفراہی کے تعارف کے سلسلے میں ایک عمدہ پیش کش اور قابل مطالعہ ہے۔امید ہے کہ قرآن سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ (محمد جرجیس کریمی)

تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ نورالحسن راشد کاندھلوی

ناشر:مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ،ضلع مظفرنگر، یوپی، ۲۰۰۷ء،ص:۱۹۲، قیمت:۷۰روپے۔

مجاہدآزادئ ہند مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (م۱۸۸۵ء) جدید ہندوستان کے مایہ ناز سپوت گزرے ہیں۔ برصغیر ہند کے مشہور علمائے دین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔علمی آثارو خدمات، جنگ آزادی میں شرکت اور بالخصوص مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں بیس سالہ تدریسی وانتظامی خدمات کے حوالہ سے ان کی شخصیت معروف ہے۔زیرنظر کتاب میں مولانا کی علمی وعملی زندگی اور حیات وخدمات سے متعلق مکمل تفصیلات جمع کردی گئی ہیں، تاکہ نئی نسل کے نوجوان،علما اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ان سے واقف ہوسکیں اور دعوت واصلاح کا کام کرنے والوں کو جذبۂ عمل اور حوصلہ مل سکے۔

اس کتاب میں مولانا محمد مظہر نانوتوی کی حیات اور علمی آثار وخدمات پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس کی تالیف میں نوادرات، مدرسہ کی روداد اور مولانا کے پس ماندگان سے حاصل کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔تفصیل سے ولادت،تعلیم و تربیت، اساتذہ سے کسب فیض، ملازمت،تحریک ۱۸۵۷ء میں شرکت، اسفارِحج،تلامذہ کا تعارف، کتابوں کی تصحیح و طباعت، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے وابستگی اور وہاں کی تدریسی وانتظامی خدمات، اخلاق وکردار اور اخلاص وایثار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔مولانا کے کئی شاگردوں کو کافی شہرت ملی، مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، علامہ شبلیؒ،مولانا عبدالحق

حقانیؒ، مولانا حشمت علی بنارسیؒ اور مفتی عبداللہ ٹونکیؒ وغیرہ۔ ایک باب میں ان کے مختصر حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا نانوتوی نے نامساعد حالات کے باوجود اور مدرسہ کی مصروفیات کے ساتھ وقیع علمی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ انھوں نے متعدد قدیم علمی کتابوں پر تعلیق وتصحیح کا کام انجام دیا ہے۔ مطبع منشی نول کشور میں رہ کر قدماء کی کتابوں کی اشاعت اور ان کی جدید طباعت کا جو کارنامہ مولانا نے انجام دیا ہے، اسے علمی دنیا میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں اصلاً مولانا کی زندگی کے اسی اہم پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ سے متعدد علمی شخصیات پر مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سیرت اور احوال و آثار پر شائع ہونے والی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے، علمی حلقوں میں اسے بھی پذیرائی حاصل ہوگی۔ (سراج احمد برکت اللہ فلاحی)

ابوالکلام آزاد (موضوعاتی ووضاحتی اشاریہ) ڈاکٹر عطا خورشید

ناشر: مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، سن اشاعت ۲۰۰۴ء، ص: ۲۵۸+۵۲، قیمت -/۵۷۵ روپے

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۷ء) پر کئی ببلیوگرافیز (Bibliographies) شائع ہوچکی ہیں، جن میں ان کی تصنیفات ومقالات اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں اور مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں عموماً الف بائی ترتیب کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ زیرِ نظر ببلیوگرافی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ موضوعاتی اور وضاحتی ہے۔ اسے ڈاکٹر عطا خورشید اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے مرتب کیا ہے اور لائبریری ہی کی جانب سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ یہ ببلیوگرافی ۱۹۹۹ء میں مکمل ہوچکی تھی، اسی لیے اس میں ۱۹۹۸ء تک شائع ہونے والی تحریروں کو شامل کیا گیا

ہے، مگر اس کی اشاعت کافی تاخیر سے ممکن ہوسکی ہے۔

اشاریہ کی ابتدا میں مولانا آزاد کی تصنیفات کی وضاحتی فہرست پیش کی گئی ہے۔ پھر ان پر لکھی جانے والی مستقل تصانیف اور مختلف مقالہ نگاروں کے مضامین کے مجموعوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کے مضامین اور خطبات کا اشاریہ ہے۔ پھر ان پر لکھے گئے مضامین کو موضوعات کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کی جن تحریروں کا انگریزی میں ترجمہ ہوگیا ہے اور ان پر جو کام انگریزی میں ہوا ہے، اس کا اشاریہ بھی شامل کتاب ہے۔

مولانا آزاد پر پہلے بھی متعدد حضرات نے ببلیوگرافیز تیار کی ہیں۔ ایک ذیلی عنوان کے تحت فاضل مرتب نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن حیرت ہوئی کہ انھوں نے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری سابق ڈپٹی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی تیار کردہ ببلیوگرافی بہ عنوان 'نقش آزاد' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ ببلیوگرافی پہلے ماہ نامہ آج کل نئی دہلی نومبر ۱۹۸۸ء (مولانا آزاد نمبر) اور سہ ماہی فکر ونظر، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، اگست ۱۹۸۹ء (ابوالکلام آزاد نمبر) میں شائع ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر انصاری ان کے گھر کے آدمی اور فکر ونظر ان کے گھر کا رسالہ تھا، پھر اس ببلیوگرافی کا ذکر کیوں نہیں آسکا؟ ایسا بھی نہیں کہ فاضل مرتب کو اس کی خبر نہ ہو، کیوں کہ 'آج کل' کے اس خصوصی شمارے میں صفیہ عارف صدیقی کی مرتب کردہ 'مولانا ابوالکلام آزاد پر منتخب مضامین کی وضاحتی فہرست' شائع ہوئی تھی، اس کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔

اس اشاریہ میں مولانا آزاد پر شائع ہونے والے مختلف رسائل ومجلّات کا تذکرہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کے قلم سے 'آج کل' کے مذکورہ خصوصی شمارے میں ان رسائل کا بھی اشاریہ شائع ہوا تھا۔

انگریزی حصہ میں، صحیح پروف ریڈنگ نہ ہوسکنے کی وجہ سے رہ جانے والی اغلاط کو درست کرنے کے لیے اغلاط نامہ منسلک کیا گیا ہے۔ پروف کی ایسی ہی غلطیاں اردو حصے میں بھی ہیں، مگر اس کا اغلاط نامہ تیار نہیں کیا گیا ہے۔ (ر-ن)

ماہ نامہ پیام سری نگر، سماجی برائیاں نمبر (جنوری-فروری ۲۰۰۸ء)

پتا: باراں پتھر، بٹہ مالو، سری نگر-۱۹۰۰۰۹، صفحات: ۱۸۴، قیمت درج نہیں۔

کشمیر جنت نظیر یوں تو دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ سے خوں چکاں ہے، لیکن ماضی قریب میں وہاں رونما ہونے والے جنسی اسکینڈل نے ملت کے ہر فرد کو شرم سار اور مضطرب کر دیا۔ ایک طرف ملت کے جیالے نوجوان ظلم و جبر، عیاری و مکّاری اور سادہ لوحی و ناعاقبت اندیشی کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں تو دوسری طرف حوّا کی بیٹیوں کی عصمت نیلام ہو رہی ہے اور اس میں سماج کے مختلف طبقات ملوّث ہیں۔ یہ صورت حال انتہائی تشویش ناک اور اضطراب انگیز ہے۔ زیر نظر خصوصی شمارہ اسی تشویش اور اضطراب کا اظہار ہے۔

اسلامی جمعیت طلبہ کشمیر کے دین پسند، تعلیم یافتہ اور صالح طلبہ اور نوجوانوں کی ایک سرگرم تنظیم ہے جو طلبہ اور نوجوانوں کو اخلاقی بے راہ روی، جنسی آوارگی اور مادہ پرستانہ نظام تعلیم کے مضر اثرات کے بچانے اور ایک مکمل اور ہمہ گیر صالح نظام زندگی کے قیام کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ماہ نامہ 'پیام' اس کا ترجمان ہے۔ اس کا خصوصی شمارہ مذکورہ اسکینڈل کے پس منظر میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے تمام مضامین اسی کے ارد گرد گردش کرتے ہیں۔ ان میں عموماً سماجی برائیوں اور خصوصاً جسم فروشی کے اسباب و محرکات کا تجزیہ کیا گیا ہے، اس میں ملوّث طبقات کی نشان دہی اور ان کی سرزنش کی گئی ہے، ملّت کی غیرت وحمیّت کو جھنجھوڑا گیا ہے، صنف نازک کی عفّت وعصمت کی قدر و قیمت واضح کی گئی ہے اور اس سماجی برائی کے ازالہ کی تدابیر اور علاج کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جموں وکشمیر کی بعض دینی وملی جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کے سربراہان اور سربر آوردہ شخصیات کے انٹرویوز اور پیغامات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

اس خصوصی شمارہ کی اشاعت جمعیت کا بروقت، اہم اور قابل قدر اقدام ہے۔ امید ہے، اسے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے گا اور اس کے ذریعے بے راہ روی اور آوارگی کی رَو پر بند لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ (ر-ن)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۲۹)

☆ مولانا سید جلال الدین عمری صدر ادارہ کی کتاب 'سوئے حرم چلا' کو قبول عام حاصل ہوا ہے۔ حال میں اس کا تیسرا ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے اپنے سفر حج وعمرہ کی روداد دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ ساتھ ہی مقاماتِ مقدسہ کی تاریخ پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ صفحات: ۶۲، قیمت -/۱۸ روپے

☆ ہر سال مولانا عمری مسجد اشاعت اسلام، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی میں عیدالفطر کا خطبہ دیتے ہیں، جسے سننے کے لیے دس ہزار سے زیادہ افراد جمع ہوتے ہیں۔ اس سال مولانا نے عیدالفطر کے موقع پر جو خطبہ دیا اس میں، عالمی اور ملکی سطح پر امت مسلمہ جن حالات سے دوچار ہے، ان پر روشنی ڈالتے ہوئے امت کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور ان سے حکمت کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی تلقین کی۔ اسے بعد میں مولانا نے تحریری شکل دے دی۔ اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے اسے 'ملک وملت کے حالات اور ہماری ذمہ داریاں' کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ صفحات: ۸، قیمت -/۶ روپے

☆ مولانا عمری کا ایک بڑا اہم کتابچہ 'فقہی اختلافات کی حقیقت' کے عنوان سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔ اب اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ چنئی نے اس کا تمل ترجمہ شائع کیا ہے۔ ۳۰/اگست ۲۰۰۸ء کو ایک تقریب میں اس کی رسم اجرا عمل میں آئی۔

☆ 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' مولانا عمری کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ عرصہ ہوا اس کا انگریزی ترجمہ "The Concept of Social Service in Islam" کے نام سے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، جامعہ دارالسلام عمرآباد نے شائع کیا تھا۔ اب اس کا ایک زیادہ معیاری اور عمدہ انگریزی ترجمہ جناب عثمان محمد اقبال صاحب نے کیا ہے، جسے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے Islam And Service to Mankind کے عنوان سے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ صفحات: ۲۰۰ مجلد، قیمت: -/۱۰۰

☆ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے کچھ عرصہ (نومبر ۲۰۰۵ء تا مئی ۲۰۰۷ء) ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی کے معاون مدیر کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے قارئین کے، زندگی کے عام معاملات سے متعلق فقہی اور دیگر سوالات کے

جوابات دیے تھے، جو زندگی نو میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے ان کا مجموعہ 'زندگی کے عام فقہی مسائل' کے عنوان سے زیر اشاعت ہے۔

☆ ۷-۸/ رجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۹-۱۰/ اگست ۲۰۰۸ء کو ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ کے زیر اہتمام 'عصر حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات' کے مرکزی موضوع پر ایک دو روزہ سمینار منعقد ہوا، جس میں دینی مدارس، عصری جامعات اور علمی و تحقیقی اداروں کے محققین نے شرکت کی۔ چار نشستوں میں سولہ مقالات پڑھے گئے اور ان پر بحث و مباحثہ ہوا۔ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس میں شرکت کی اور 'موجودہ دور میں رجوع الی القرآن کی دعوت: انحرافات اور ان کا تدارک' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔

☆ ادارۂ تحقیق کا 'دو سالہ تصنیفی تربیت پروگرام' الحمد للہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کے تحت طلبہ کو دینی موضوعات پر تحریر و تصنیف کی مشق بہم پہنچائی جاتی ہے۔ ادارہ میں انھیں قیام کی سہولت فراہم کرنے کے علاوہ ضروری مصارف کے لیے اسکالرشپ بھی دی جاتی ہے۔ الحمدللہ اس سلسلہ میں ادارہ کو بعض اہل خیر کا سرگرم تعاون حاصل ہے۔

☆ عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ادارہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر اس کی موجودہ عمارت کی پہلی منزل کی تعمیر ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اور ادارہ کے بہی خواہاں اور علمی کاموں سے دل چسپی رکھنے والے اصحاب خیر سے تعاون کی امید پر کام شروع کرادیا گیا ہے۔ پہلی منزل کا تخمینہ پچیس لاکھ روپے ہے۔ اصحاب خیر سے گزارش ہے کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بھرپور تعاون فرمائیں۔

گزشتہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء) کے آخر میں صدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی جو انھوں نے اپنی ویب سائٹ کے افتتاح کے موقع پر پیش کی تھی۔ اس میں ص ۱۲۰ کے شروع میں کچھ جملے چھوٹ جانے کی وجہ سے عبارت گنجلک ہوگئی ہے۔ براہ کرم اسے اس طرح پڑھا جائے:

''جماعت اسلامی کے ترجمان ماہ نامہ زندگی میں بہت سے مضامین شائع ہوئے اور ایک مرحلہ میں پانچ سال تک اس کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے''

فہرست مضامین سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ، جلد ۲۷، ۲۰۰۸ء

مضامین	مضمون نگاران	شمارہ	صفحات
حرف آغاز			
ترجیحات دین	سید جلال الدین عمری	۱	۱۴-۵
اسلامی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے	،،	۲	۱۳۴-۱۲۵
شہادت علی الناس (امت وسط کی ذمہ داری)	،،	۳	۲۵۸-۲۴۵
دینی علوم کی تدریس، ہندوستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات	،،	۴	۳۸۰-۳۶۵
تحقیق وتنقید			
فکرِ ولی اللہی کی اشاعت میں مولانا صدرالدین اصلاحی کا حصہ	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱	۴۳-۱۵
استدراک (بر مضمون فکر ولی اللہی کی اشاعت...)	محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۴۷-۴۴
تدوین قرآن اور صحف صدیقی	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۲	۱۴۳-۱۳۵
کتبِ حدیث میں قدیم عربی داستانیں	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	۲	۱۵۵-۱۴۵
عربی زبان میں خودنوشت سوانح نگاری کا ارتقاء	ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی	۳	۲۸۲-۲۵۹
ہندوستان میں اشاعت اسلام- چند اعتراضات کا جائزہ	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	۴	۴۰۶-۳۸۱
بحث ونظر			
قرآن کا تصور امن	پروفیسر سید مسعود احمد	۱	۷۰-۴۹
مابعد جدیدیت کا چیلنج اور تحریک اسلامی	انجینیر سید سعادت اللہ حسینی	۲	۱۸۶-۱۵۷
محدثین کا جامع تصورِ دین	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲	۲۰۰-۱۸۷
اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی	ڈاکٹر اوصاف احمد	۳	۲۹۴-۲۸۳
تحریک آزادی میں فتاویٰ کا کردار	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۳	۳۲۰-۲۹۵
انسانی حقوق اور فدائی حملے	ڈاکٹر عبدالکریم عثمان	۴	۴۳۳-۴۰۷
فی ظلال القرآن کی بعض تفسیری خصوصیات	سید حامد عبدالرحمٰن الکاف	۴	۴۴۷-۴۳۵
سیر وسوانح			
مولانا مناظر احسن گیلانی کی مکتوب نگاری	جناب امان اللہ راٹھور	۱	۹۲-۷۱
شیخ ہجویری اور ان کی کتاب کشف المحجوب	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۲	۲۲۷-۲۰۱

مولانا گوہر رحمٰن کی علمی خدمات -ایک جائزہ	جناب غلام حسین بابر	۳	۳۲۱-۳۳۹
علامہ خطابی کے علمی آثار	ڈاکٹر حاتم صالح الضامن		
مترجم: جناب سراج احمد برکت اللہ فلاحی		۴	۴۴۹-۴۶۳

نقد واستدراک

نظم قرآن: شاہ ولی اللہ اور مولانا مودودی کے نظریات	پروفیسر احتشام احمد ندوی	۳	۳۴۰-۳۴۳

روداد سفر

امیر جماعت کی معیت میں تامل ناڈو کا سفر	محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۹۳-۱۱۸

تعارف وتبصرہ

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ان کی علمی خدمات	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱	۱۱۹-۱۲۰
مقصد زندگی کا اسلامی تصور	محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۲۲۹-۲۳۱
قرآن کے دو باب (الفاتحہ والبقرۃ)	جناب مجاہد شبیر احمد فلاحی	۲	۲۳۲-۲۳۳
مدارس کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم کا مقام	سراج احمد برکت اللہ فلاحی	۲	۲۳۳-۲۳۵
شیخ عبداللہ علی المطوع - حیات اور خدمات	محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۲۳۵-۲۳۶
سنّتوں کا تنوع - ہر سنت نبوی افضل ہے	جناب مجاہد شبیر احمد فلاحی	۳	۳۴۴-۳۴۹
تعمیر معاشرہ اور مساجد	سراج احمد برکت اللہ فلاحی	۳	۳۴۹-۳۵۲
عصر حاضر میں اسوۂ رسول کی معنویت	محمد رضی الاسلام ندوی	۳	۳۵۳-۳۵۵
کاروان رفتگاں	،،	۳	۳۵۵-۳۵۵
تعلیمات قرآن	،،	۴	۴۶۴-۴۶۶
قرآن کریم کی سائنسی تفسیر-ایک تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی	۴	۴۶۶-۴۶۹
مولانا حمید الدین فراہیؒ-مفسّر ومحقّق	مولانا محمد جرجیس کریمی	۴	۴۶۹-۴۷۱
تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ	سراج احمد برکت اللہ فلاحی	۴	۴۷۱-۴۷۲
ابوالکلام آزاد (موضوعاتی ووضاحتی اشاریہ)	محمد رضی الاسلام ندوی	۴	۴۷۲-۴۷۳
ماہ نامہ پیام سری نگر (سماجی برائیاں نمبر)	،،	۴	۴۷۴-×

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی	ادارہ	۲	۲۳۷-۲۴۰
،، ،، (۲۸)	،،	۳	۳۵۷-۳۶۰
،، ،، (۲۹)	،،	۴	۴۷۵-۴۷۶

فہرست مضمون نگاران سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جلد ۲۷، ۲۰۰۸ء

مضمون نگاران	مضامین	شمارہ	صفحات
اصلاحی، صفدر سلطان	عربی زبان میں خودنوشت سوانح نگاری کا ارتقا	۳	۲۸۲-۲۵۹
اصلاحی، ظفر الاسلام	تحریک آزادی میں فتاوی کا کردار	۳	۳۲۰-۲۹۵
اوصاف احمد	اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی	۳	۲۹۴-۲۸۳
بابر، غلام حسین	مولانا گوہر رحمٰن کی علمی خدمات -ایک جائزہ	۳	۳۳۹-۳۲۱
حسینی، سید سعادت اللہ	مابعد جدیدیت کا چیلنج اور تحریک اسلامی	۲	۱۸۶-۱۵۷
راٹھور، امان اللہ	مولانا مناظر احسن گیلانی کی مکتوب نگاری	۱	۹۲-۷۱
صدیقی، محمد یٰسین مظہر	تدوین قرآن اور صحف صدیقی	۲	۱۴۳-۱۳۵
،،	فکر ولی اللہی کی اشاعت میں مولانا صدرالدین اصلاحی کا حصہ	۱	۴۳-۱۵
الضامن، حاتم صالح	علامہ خطابیؒ کے علمی آثار	۴	۴۶۳-۴۴۹
عثمان، عبدالکریم	انسانی حقوق اور فدائی حملے	۴	۴۳۳-۴۰۷
عمری، سید جلال الدین	اسلامی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے	۲	۱۳۴-۱۲۵
،،	ترجیحات دین	۱	۱۴-۵
،،	دینی علوم کی تدریس، ہندوستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات	۴	۳۸۰-۳۶۵
،،	شہادت علی الناس (امت وسط کی ذمہ داری)	۳	۲۵۸-۲۴۵
فلاحی، سراج احمد	تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی (تبصرہ)	۴	۴۷۲-۴۷۱
،،	تعمیر معاشرہ اور مساجد (تبصرہ)	۳	۳۵۲-۳۴۹
،،	علامہ خطابی کے علمی آثار (ترجمہ)	۴	۴۶۳-۴۴۹
،،	مدارس کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم کا مقام اور اس کا منہج تدریس (تبصر)	۲	۲۳۵-۲۳۳
فلاحی، مجاہد شبیر احمد	سنتوں کا تنوع - ہر سنت نبوی افضل ہے	۳	۳۴۹-۳۴۴
،،	قرآن کے دو باب (الفاتحہ والبقرۃ)	۲	۲۳۳-۲۳۲
الکاف، سید حامد عبدالرحمٰن	فی ظلال القرآن کی بعض تفسیری خصوصیات	۴	۴۴۷-۴۳۵

قاسمی، محمد سعود عالم	کتبِ حدیث میں قدیم عربی داستانیں	۲	۱۴۵-۱۵۵
قاسمی، محمد شمیم اختر	ہندوستان میں اشاعت اسلام- چند اعتراضات کا جائزہ	۴	۳۸۱-۴۰۶
کرمانی، محمد ریاض	قرآن کریم کی سائنسی تفسیر-ایک تنقیدی مطالعہ (تبصرہ)	۴	۴۶۶-۴۶۹
کریمی، محمد جرجیس	محدثین کا جامع تصور دین	۲	۱۸۷-۲۰۰
،،	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ان کی علمی خدمات (تبصرہ)	۱	۱۱۹-۱۲۰
،،	مولانا حمید الدین فراہی-مفسّر ومحقق (تبصرہ)	۴	۴۶۹-۴۷۱
مسعود احمد، سید	قرآن کا تصور امن	۱	۴۹-۷۰
ندوی، احتشام احمد	نظم قرآن: شاہ ولی اللہ اور مولانا مودودی کے نظریات	۳	۳۴۰-۳۴۳
ندوی، محمد رضی الاسلام	ابوالکلام آزاد-موضوعاتی و وضاحتی اشاریہ (تبصرہ)	۴	۴۷۲-۴۷۳
،،	استدراک (بر مضمون فکر ولی اللّٰہی کی اشاعت...)	۱	۴۴-۴۷
،،	امیر جماعت کی معیت میں تامل ناڈو کا سفر	۱	۹۳-۱۱۸
،،	تعلیمات قرآن (تبصرہ)	۴	۴۶۴-۴۶۶
،،	شیخ عبداللہ علی المطوّع- حیات اور خدمات (تبصرہ)	۲	۲۳۵-۲۳۶
،،	عصر حاضر میں اسوۂ رسول کی معنویت (تبصرہ)	۳	۳۵۳-۳۵۵
،،	کاروان رفتگاں (تبصرہ)	۳	۳۵۵-۳۵۶
،،	ماہ نامہ پیام سری نگر (سماجی برائیاں نمبر)	۴	۴۷۴-x
،،	مقصد زندگی کا اسلامی تصور (تبصرہ)	۲	۲۲۹-۲۳۱
نعمانی، رئیس احمد	شیخ علی بن عثمان ہجویری اور ان کی کتاب کشف المحجوب پر ایک نظر	۲	۲۰۱-۲۲۷

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>